احمد صدیق مجنوں

شخصیت اور فن

مجنوں کہ اس کا جوش جنوں ہے کمال ہوش
اس شخص کو پیمبر روح ادب لکھو
(رئیس امروہوی)

مصنفہ

ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن

ناشر

صدیق الرحمٰن

صدر:- الہدیٰ ویلفیر ایسوسی ایشن
متصل نخاس پولس چوکی
احاطہ کورٹ صاحب گورکھپور۔ ۲۷۳۰۰۱

نام کتاب.................احمد صدیق مجنوں شخصیت اور فن
نام مصنفہ.................ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن
پہلا ایڈیشن.................سنہ ۲۰۱۰ء
قیمت.................-/۱۷۰
تعداد.................۶۰۰
کمپوزنگ.................نصر اللہ ابن القمر الحسینی قاسمی
مطبع.................ہالہ پریس محلہ دھمال نزد جامع مسجد گورکھپور

ملنے کا پتہ

الھدیٰ ویلفیئر ایسوسی ایشن بگہی بھاری۔ پی پی گنج۔ گورکھپور
ادبی مرکز نزد جامع مسجد اردو بازار گورکھپور

انتساب

میجر صدیق الرحمٰن کے نام

یہ انھیں کی کاوش اور محنت کی دین ہے۔

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

فہرست مضامین

(حرفِ آغاز)

(حرف آغاز)

شوکت تھانوی نے مجنوں گورکھپوری کے ڈیڑھ چھٹانک کا آدمی اور اردو ادب کا انسائیکلوپیڈیا کہا ہے، ان کا جنم پلدہ (بستی) میں ہوا اور منجھریا میں پروان چڑھا، ۱۲ برس کی عمر میں گورکھپور آئے اور ادبی فضاؤں نے ادبی استقامت پیدا کی، دادی کی بے لوث محبت نے اردو، عربی، اور فارسی کی اچھی تعلیم دی، دادا نے منقولات اور معقولات کی گر سکھایا اساتذہ نے مجنوں کی ادبی لیاقت کو پہچانا اور اپنے نقوش ان کے سامنے رکھدئے جس سے رفتہ رفتہ ان کے ادبی کارنامے شناسائیوں اور قارئین کے جھرمٹ میں آتے گئے، کسی کو کیا معلوم تھا کہ ایک غیر آباد خطہ کا رہنے والا اردو ادب کی تاریخ میں ایسے کارنامے انجام دے گا جو رہتی دنیا تک سنگ میل کا کام دے گی۔

میں اپنی ابتدائی زندگی سے ہی مجنوں کی ذہانت اور کارکردگی کے چرچے سنا کرتی تھی، مگر نہ تو ان کی طالب علم رہی اور نہ ہی ان کو دیکھنے کا موقع ملا پھر بھی دل میں یہ تمنا تھی کہ اس جانفزا بادے سے لطف اٹھایا جائے اور اس کے ادبی مشاغل سے قارئین کو روشناس کرایا جائے۔

مجنوں گورکھپوری کسی تعارف کے محتاج نہیں پھر بھی ان کے کارناموں کو قارئین تک پہنچانے کی میری یہ کاوش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے، گورکھپور کی ادبی محفلیں اس نایاب ہستی کو فراموش نہیں کرسکتیں، جس نے علم کی تحصیل کے لئے واحد لائبریری سے لے کر گورکھپور کے کسی بھی ادبی کنج کو نہیں چھوڑا، ابتدائی زندگی میں جو مسودے تیار کئے تھے ان تک تو نہیں پہونچ سکے مگر اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے انہوں نے درس وتدریس کا نایاب نسخہ چنا، اور ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ انٹر کالج

گورکھپور سے انھوں نے نئے سفر کا آغاز کیا بعد ازاں سینٹ اینڈ ڈیوز پوسٹ گریجویٹ کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے جہاں پر وہ بڑے تن دہی سے ۱۹۵۸ء تک رہے، ان کی بے پناہ صلاحیتوں، اصولوں اور تعلیمی خدمات نے انھیں اتنا روشن کردیا کہ ان کی آواز دور دور تک سنائی دینے لگی، وہ کبھی چین سے بیٹھنا نہیں جانتے تھے ان کا حکم تھا کہ خلوت میں کوئی طالب علم آئے تو مجھے خبر دی جائے جس سے وہ طالب علموں کے دل میں اتر چکے تھے ان کے کاموں نے کالج کی کمیٹی کو بھی بہت متاثر کیا، مجنوں ایک پروقار شخصیت کا نام ہے جب ان کی سواری شاہی امام باڑہ سے کالج کی طرف روانہ ہوتی تھی تب ان کی سج دھج قابل دید تھی بڑی مہری کا پائجامہ، سفید سلک کا کرتا، اس پر سفید اچکن ہاتھ میں خوبصورت چھڑی پیروں میں بوٹ آنکھوں پر گولڈن کمانی کا چشمہ منھ میں پان کی گلوری بیچ سے مانگ نکالے ہوئے صاف ستھرا رنگ بہت ہشاش بشاش کالج کے گیٹ پر تانگے سے اترتے وہ اوپر سے خوش مزاج مگر اندر سے زخم خوردہ نظر آتے تھے تانگے سے اترنے کے بعد سیدھے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے ان کے پہنچتے ہی کالج میں سکوت کا عالم طاری ہوجاتا طالب علموں کو ان سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ تھی پڑھانے کا انداز پرکشش تھا، کبھی بھی کالج سے غیر حاضر نہ ہوتے الّا یہ کہ طبیعت ناساز ہوجائے۔

سینٹ انڈ ڈیونکالج میں ان کا قیام تقریباً ۲۲ رسال رہا اس دوران میں ان کی ان گنت تصانیف منظر عام پر آچکی تھی، بیشتر مشاعروں کا انتظام کیا، انجمنوں کی بنا ڈالی اور گورکھپور کے ماحول میں ادبی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں گو یہ علاقہ دبستان کی سرحد تک نہیں پہنچ سکا، ادبی ماحول قابل دید تھا اس سرزمین پر نثر نگاروں میں مہدی افادی، قاضی تلمذ حسین، احسان اللہ عباسی، اور خود مجنوں گورکھپوری کی شخصیت ایک عظیم رتبے کی حامل ہے اس کے علاوہ شعراء میں فراق گورکھپوری، ہندی

گورکھپوری کے علاوہ ان گنت معیاری شعراء تھے اور ہیں، جس کی نشاندہی آپ کو ہماری کتاب (سخنورانِ گورکھپور) میں ملے گی، مجنوں میں سیمابی کیفیت پائی جاتی تھی اس لئے وہ کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہر سکے ان کا قدم مسلسل آگے بڑھتا رہا ۱۹۵۸ء میں علی گڈھ کے شعبہ اردو کو آباد کیا اور وہاں بھی دس سال سے زیادہ قیام نہ رہا مگر اپنی کارگذاریوں سے غافل نہ تھے اردو کی ترقی کے لئے ہر لمحہ کوشاں تھے علی گڈھ سے ۱۹۶۸ء میں وہ کراچی یونیورسٹی پاکستان پہنچ گئے اور ملک کو خیر آباد کہا، پاکستان میں ان کے اعزاز میں تعظیمی جلسے ہوئے آن ریری پروفیسر شپ کی ڈگری سے نوازہ گیا اور دس سال تک کراچی یونیورسٹی سے منسلک رہے قوئی جواب دیتے چلے جارہے تھے مگر یہ علم وفن کا پجاری اپنے دل ودماغ کی توانائی سے دوسروں کو سرشار کرتا رہا، شعبۂ اردو کے صدر نے ان سے کہا کہ مجنوں صاحب آپ کو روز شعبہ میں آنے کی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے ہفتہ میں ۳رچار ایام آجایا کیجئے بقیہ دن آرام فرمائیے مجنوں صاحب نے جواب دیا میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری منزل تک پہنچ جاؤں اور کام ادھورا رہ جائے، قیام پاکستان میں انھوں نے بہت سے ادبی نکات کو اجاگر کیا اور اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے میں کوئی خامی نہ آنے دی، اس امر کی ساری تفصیلات باب اول میں گاؤں سے لے کر کراچی پاکستان کے ناظمہ آباد کے اس کمرے تک کی عکاسی کارنے کی کوشش کی ہے، کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے اکا انحصار (سہرہ) قارئین کے سر ہے، مجنوں صاحب تو نہیں رہے مگر آج بھی گورکھپور کی فضاؤں میں ان کے چرچے جاری ہیں انجمن ان کی یاد میں مشاعرے اور مباحثے کا نظم کرتی ہے کامرس اسلامیہ کالج گورکھپور نے مجنوں گورکھپوری کے نام پر ایک ہال بھی تعمیر کرایا ہے جس کے ابتدائیہ جلسے میں حمید اللہ صدیقی جن کا قیام لندن میں ہے صدارت کی کرسی سے بڑے سلیقگی سے مجنوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی اور ان کے اس شعر پر اپنی بات ختم کی

اس قدر جامہ سے باہر ہے ترازندانی
آج زنجیر عناصر سے رہا ہوتا ہے

اس کے بعد شبنم گورکھپوری نے ایک غزل سنائی۔

مجنوں اپنے غم اور تفکرات سے پر زندگی کو اس طرح سے قارئین کے سامنے پیش کیا جس میں غم اندوہ کا شائبہ نظر نہیں آتا، انھوں نے ہنس ہنس کر کڑوے گھونٹوں کو اس طرح ہضم کیا کہ اس کی سدھ بدھ کا بھی اندازہ قارئین کیا ادب نواز بھی نہ کر سکے انھیں تمام خوبیوں نے مجھے مجبور کیا کہ اس ادیب کے روشن کارناموں کو اس طرح سے بیان کیا جائے کہ عقیدت کا حق ادا ہو جائے۔

احمد صدیق کی کتاب کو مرتب کرنے میں جن اشخاص نے تعاون کیا ہے اس کا ہم تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں خاص طور سے فیاض صاحب کی بے لوث محبت کی مشکور ہوں کہ انھوں نے مواد کی فراہمی میں بڑی مدد کی اس سلسلہ میں مسیح الزماں شبنم گورکھپوری کی بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجنوں کے طالب علم ہونے کی وجہ سے ان کے طرز زندگی اور دیگر اصولی زندگی کو بڑے اچھے ڈھنگ سے بتانے کی کوشش کی ہے اپنے سفر پاکستان میں مجنوں سے جو گفت وشنید ہوئی اس سے بھی روشناس کرایا میں حافظ انیس الرحمٰن کی بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر کتاب کی طباعت میں مدد فرمائی آخر میں میں میجر صدیق الرحمٰن کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے کہ انھوں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک اپنے علی گڈھ تعلیمی قیام میں مجنوں صاحب کے خاندان سے جو روابط تھے اس پر بڑی اچھی روشنی ڈالی، میں مجنوں صاحب کے بھانجے احمد سعید صاحب کی بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے موصوف کی ابتدائی زندگی اور خاندانی حالات کو راقم تک پہنچانے میں ہر ممکن تعاون کیا، میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میری کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے رکھ لی ہے۔

بشریٰ رحمٰن

(مقدمہ)

''احمد صدیق مجنوں شخصیت اور فن'' از بشریٰ رحمٰن

شمس الرحمٰن فاروقی

مجنوں گورکھپوری نے زمانۂ نوجوانی میں ہی غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی، ان کی وسعت مطالعہ، انگریزی اور فارسی ادب سے ان کی گہری واقفیت اور تخلیقی قوت کے وفور کی بنا پر نثر و نظم سب پر مکمل اختیار، اور ان سب سے بڑھ کر ان کا انداز تدریس، ان سب چیزوں نے مل کر ان کی شخصیت میں ایک افسانویت پیدا کر دی تھی، مجنوں صاحب کا نام سنتے ہی ہم لوگوں کے ذہن میں ان کے دماغ کی دراکی اور بے باکی اور ان کے مطالعے کی قاموسیت کا خیال سب سے پہلے آتا تھا۔ یہ بات کہ وہ بہت چھوٹے قد کے بہت دبلے پتلے بے حد خوش پوش اور نازک مزاجی کی حدت تک حساس واقع ہوئے ہیں، ہمارے لئے کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھیں، لہٰذا ہم لوگ ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی مجنوں صاحب کی شخصیت کا حصہ نہ سمجھتے تھے۔

میری نسل کے لوگوں نے مجنوں صاحب کا نام بہت لڑکپن ہی میں سن لیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اور میرے والد صاحب بی اے میں ہم جماعت تھے، مجنوں صاحب عمر میں میرے باپ سے چھ سال بڑے تھے لیکن بیچ میں کچھ عرصے

کے لئے پڑھائی ترک کرنے کی وجہ سے بی۔اے میں میرے باپ کے ہم سبق ہو گئے تھے۔ لیکن جب ہم لوگ گورکھپور پہنچے تو اس بات سے واقف ہونے کے باوجود کہ میرے باپ کے ہم سبق رہ چکے تھے، میری ہمت کبھی نہ پڑی کہ میں اس تعلق کے واسطے سے ان سے ملوں۔ ایک آدھ بار میرے والد صاحب نے کہا بھی کہ چلو تمھیں ان سے ملانے لے چلیں گے۔ لیکن اس کی نوبت نہ آئی، اور ہم لوگ مجنوں صاحب کو دور سے دیکھ لینے اور کبھی کبھی ایک آدھ بات پوچھ لینے پر ہی قناعت کر لیتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں مجنوں صاحب کی کتاب ''اقبال'' چھپی تو اس کا بڑا غلغلہ ہوا کیونکہ انھوں نے اقبال کی بہت سی باتوں پر اعتراض کیا تھا، اور سب اعتراضات فلسفیانہ اور سیاسی نوعیت کے تھے۔ اقبال کی شاعری کی خوبصورتی کے وہ بھی قائل نظر آئے۔ لیکن اقبال مخالف باتیں جو انھوں نے کہیں وہ بہت مشہور ہوئی۔ مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مجنوں صاحب کی شہرت اس کتاب کی وجہ سے پھیلی۔ ان کے ترقی پسند خیالات اور خاص کر ان کے مضمون ''ادب اور زندگی'' ۱۹۲۹ء میں اردو ادب کو سماجی معنویت اور ترقی پسند انقلابیت سے ہم کنار کرنے کی کوشش، اور یہ سب اس وقت جب ترقی پسند تحریک کا وجود بھی نہیں ہوا تھا، ان کی شہرت کو اردو ادب میں پوری طرح قائم کر چکے تھے۔ دوسری طرف، وہ ادب کی ادبی معنویت کے وہ اس قدر قائل بھی نظر آتے تھے کہ انھوں نے حکیم تصدق حسین عرف نواب مرزا جو اردو ادب میں نواب مرزا شوق کے نام سے مشہور ہیں ان کی ''بدنام'' مثنوی ''زہر عشق'' اپنے مفصل دیباچہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کی۔ اس کے بعد انھوں نے میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' پر بھی مضمون لکھا اور ۱۹۳۵ء میں انھوں نے میر پر اپنا مشہور مقالہ لکھا جسے ایک طرح سے جدید زمانے میں میر شناسی کے نئے انداز کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔

مجنوں صاحب نے فلسفیانہ نثر، بیانیہ نثر، تنقیدی نثر، اس طرح کے تمام نثری

اسالیب پر اپنی چھاپ چھوڑی۔ ان کی نثر میں غیر معمولی خود اعتمادی کے ساتھ بے حد روانی اور سلاست تھی۔ ایسا لگتا ہی نہ تھا کہ وہ اپنی علمیت کے اظہار کو اپنے خیالات کے اظہار پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اگر چہ یہ اکثر کہا گیا کہ مجنوں صاحب کے بعض مشہور افسانے انگریزی ناول نگاروں خاص کر ٹامس ہارڈی پر مبنی ہیں، لیکن ان کے کئی افسانے ایسے بھی ہیں مثلاً ''سمن پوش'' جن پر کسی زبان کے افسانے کا اثر نہیں ہے اور یہ افسانہ اردو ادب میں اپنے رنگ میں لاجواب کہا جا سکتا ہے،

مجنوں صاحب کی شہرت جب نئی بلندیوں کو چھو رہی تھی تو بعض مجبوریوں کے باعث پاکستان چلے گئے۔ وہاں ان کی بہت قدر ہوئی اور ۱۹۸۸ء میں جب چوراسی برس میں ان کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ پاکستان میں ایک افسانوی شخصیت اور پرانے زمانے کے عالموں کی طرح ہر فن پر حاوی حکیم سمجھے جانے لگے تھے۔ لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ مجنوں صاحب کی ادبی سرگرمیاں پاکستان میں سردی کی طرف مائل ہو گئیں۔ اور انھوں نے وہاں صرف ایک کتاب غالب پر لکھی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔

ہندوستان مجنوں صاحب کے لاتعداد شاگرد اب بھی ہوں گے کیونکہ وہ اردو اور انگریزی دونوں کے استاد تھے اور دونوں جماعتوں کے طالب علم ان کے طریقۂ تدریس کے گرویدہ تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کے بارے میں کوئی تفصیلی کتاب ہندوستان میں پچھلے کئی برس میں نہیں لکھی گئی۔ صہبا لکھنوی نے پاکستان میں ''ارمغان مجنوں'' کے نام سے دو جلدیں شائع کی تھیں وہ سب کی دسترس میں نہیں ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ ''ارمغان مجنوں'' کے مشمولات کے علاوہ بھی بہت سی باتیں اور بہت سے پہلو مجنوں صاحب کے ادب اور زندگی کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ گورکھپور کی بشریٰ رحمٰن مجنوں صاحب پر کام کر رہی ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ گورکھپور ہی کی طالب علم کو مجنوں صاحب پر کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے

مجنوں کی تحریروں کا ایک انتخاب بھی شائع کیا اور اس کے بعد مجنوں صاحب کے کارناموں اور ان کی زندگی پر ایک تفصیلی کتاب کا بھی ڈول ڈالا۔ یہ کتاب اب مکمل ہو کر میرے سامنے ہے لیکن افسوس کہ اب بشریٰ رحمٰن اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت ان کے سامنے ہوئی ہوتی تو کیا خوب تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ بشریٰ رحمٰن کے لائق اور ادب دوست شوہر میجر صدیق الرحمٰن نے اس کتاب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ مصنفہ خود گورکھپور کے ایک مشہور اور علم دوست خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ مشہور اسلامی ماہر اقتصادیات اور اسلامیات پروفیسر نجات اللہ صدیقی ان کے بڑے بھائی ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے اپنا زیادہ تر علمی کام شادی کے بعد کیا اور یہ بڑی تعریف اور فخر کی بات ہے۔ کیوں کہ آج کل کے زمانے میں شادی کے بعد گھر گرہستی میں اس طرح پھنس جاتی ہیں کہ اور کسی کام کے لائق نہیں رہتیں۔ بشریٰ رحمٰن نے شادی کے بعد بھی اپنا علمی ذوق برقرار رکھا اور اسے پروان چڑھایا۔ اس میں ان کے شوہر میجر صدیق الرحمٰن کا بھی دخل یقیناً رہا ہوگا۔ اور میں انھیں اس بات کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔

میں امید کرتا ہوں کہ مجنوں صاحب پر یہ کتاب، موضوع کتاب کی ہی طرح مشہور و مقبول ہوگی۔

الٰہ آباد ۲ رجون ۲۰۱۰ء

شمس الرحمٰن فاروقی

(۳)

مجنوں کا خاندان
اور
حالات زندگی

مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، انگریزوں کا اقتدار بڑھتا جارہا تھا اور پورا ملک بدامنی کے شکار میں مبتلا تھا ایسے ماحول میں مجنوں گورکھپوری کے آباواجداد شیراز (ایران) سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئے، ان کے مورث اعلیٰ سید نیاز علی جو شجرہ کے مطابق مجنوں کے دادا کے دادا تھے، دلی کا پرامن ماحول نہ دیکھ کر اودھ کا رخ کیا جہاں ان کو نواب اودھ کے وہاں معقول ملازمت مل گئی اور وہ اپنی کارگزاریوں میں لگ گئے۔

نوابین کو اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے راجا خلیل آباد اور مگہر کے علاقوں میں ان کی قائم کردہ چوکیوں پر حملہ کرتے تھے اور وہاں کے مسلمان باشندوں کو پریشان کرتے ان کی دیکھ ریکھ کے لئے اس علاقہ میں ایک وفد بھیجا جس میں مجنوں کے مورث اعلیٰ سید نیاز علی بھی شامل تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اچھا موقع عطا کیا کہ وہ آس پاس کے مواضعات کا بغور جائزہ لیں اسطرح سے پلدہ ان کو ایسی جگہ مل گئی جو ان کے خاندان کی رہائش کے لئے مناسب تھی، یہ جنگلی علاقہ بالکل غیر آباد تھا نوابوں کے توسل سے کافی جائداد ان کو عطیہ میں ملی، پلدہ کے اس حصہ میں جہاں آباد ہونا تھا رہائشی مکان کے علاوہ عبادت کے لئے ایک مسجد اور امام چوک تعمیر کرائی، بقول احمد سعید مجنوں کے بھانجے،

> ''کہا جاتا ہے کہ سید نیاز علی صاحب کی کوئی اولاد جب بہت دنوں تک نہیں ہوئی تو انھوں نے پیروں اور فقیروں سے دعا کی درخواست کی، ایسا بتایا جاتا ہے کہ کسی فقیر نے ان سے کہا کہ اگر وہ کسی جنگل یا غیر آباد جگہ پر جاکر اسے آباد کریں وہاں پر ایک مسجد اور امام چوک تعمیر کرواکے اولاد کے لئے اللہ سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو اولاد کی دولت سے سرفراز کرے گا بڑی التجا اور دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند عطا کیا جس کا نام انھوں نے مدار بخش رکھا''

پلدہ گاؤں اگرچہ آبادی کے لحاظ سے بہت مختصر ہے مگر قدرتی مناظر سے بھر پور اور فضائی آلودگی سے پاک اس گاؤں کا نظارہ دیکھتے بنتا ہے وہاں ایک تالاب ہے جس میں مجنوں کے خاندان کے بزرگ مچھلی اور مرغابیوں کا شکار کرنے آتے تھے وہ گاؤں آج بھی اسی معیار پر قائم ہے، مجنوں بھی اپنے پورے خاندان کے ساتھ چھٹیوں میں جایا کرتے اور چند ایام شکار اور تفریح میں گزارتے، اس خاندان نے دھیرے دھیرے کر کے اپنے ارضیات کو بڑھانا شروع کیا اور بہت سے مواضعات میں ان کی ملکیت بن گئی خاص طور سے منجھریا موضع زیادہ اہمیت اس لئے رکھتا ہے کہ اس گاؤں میں ان کی بہت بڑی آراضی ہوگئی اور خاندان کے لوگ پلدہ اور منجھریا دونوں جگہ رہنے لگے، یہ بھی گاؤں ضلع بستی میں تھے جائداد کے بٹوارے کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ تقسیم ہوتی تھی تو کسی بھی گاؤں کی جائداد اولاد کو ملتی تھی اسطرح سے مجنوں کے والد فاروق دیوانہ صاحب کو ان کا حصہ منجھریا اور پلدہ میں ملا اسی وجہ سے مجنوں کے آباواجداد پلدہ اور منجھریا دونوں گاؤں میں رہے، اور مجنوں کا بچپن بھی دونوں گاؤں میں گذرا۔ یہ خاندان بہت ذی علم تھا، مجنوں کے دادا سید لعل محمد اردو فارسی، عربی کے عالم تھے اور ان کی دادی عابدہ خاتون جو گورکھپور کے محلہ چھوٹے قاضی پور کی تھیں ان علوم سے اچھی واقفیت کے ساتھ حافظ قرآن بھی تھیں، مجنوں کے والد فاروق دیوانہ جو اپنے وقت کے متبحر عالم اور ریاضی داں تھے قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت وفطانت عطا کیا تھا، طبیعت میں سیمابی کیفیت رکھتے تھے اس لئے کسی میدان میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی، بھلا ہو رشید احمد صدیقی کا کہ ان کی دور بینی نے فاروق میں چھپے ہوئے جوہر پہچان لئے اور انھیں منظر عام پر لا کھڑا کیا ورنہ ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو گورکھپور کے چند ادیبوں اور شعراء کا ہوا۔

فاروق صاحب کی پیدائش گورکھپور میں ۲۴ / مارچ ۱۸۸۸ء کو ہوئی اور ان کی پرورش ان کے آبائی گاؤں پلدہ میں ہوئی، بچپن کا کچھ حصہ منجھریا میں گزرا جو مگہر کے

قرب وجوار میں ہے سات سال کی عمر میں بغرض تعلیم گورکھپور آگئے ۱۹۰۱ء میں مشن اسکول میں داخل کیئے گئے اور وہاں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ۱۹۰۳ء میں سینٹ اینڈ ڈیوز کالج سے بارہویں درجے کی سند حاصل کی اس کے بعد مشن اسکول میں جغرافیہ کے استاد ہونے کے ساتھ جناب واجد علی شاہ میاں کے نواسے جمشید علی شاہ کے اتالیق بھی ہو گئے تھے، جمشید صاحب بغرض تعلیم علی گڈھ گئے تو فاروق صاحب کو بھی ہمراہ جانا پڑا یہ ان کے لئے بہت سنہرا موقع تھا کہ وہ اپنی بقیہ تعلیم پوری کرسکیں، انھوں نے بی۔ ایس۔ سی۔ B.S.C میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۰۹ء میں بی۔ ایس۔ سی۔ کی ڈگری حاصل کر لی اور ۱۹۱۳ء میں ریاضیات میں ایم۔ ایس۔ سی۔ M.S.C کی سند حاصل کی، اس طرح سے انھوں نے اپنی تعلیم پوری کی، بقول رشید احمد صدیقی۔

> ''فاروق صاحب نے ریاضیات کو طلباء کے لئے دل چسپ اور سبق آموز بنا دیا تھا وہ سارے علوم کو ایک رشتے میں منسلک سمجھتے تھے مزاج میں بڑی اضطرابی کیفیت تھی یکسوئی ان سے کوسوں دور تھی مختلف مقامات پر دیکھے جاتے ملازمت کے سلسلے میں یہ حال تھا کہ دوستوں اور احبابوں کے اصرار کے باوجود کسی جگہ پر ٹک نہ سکے ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ وہ سر ضیاء الدین کے توجہ پر علی گڈھ یونیورسٹی میں ریاضیات کے استاد ہو گئے مختلف علوم کے ماہر تھے جب کسی علمی مسئلے پر گفتگو ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا چلا آرہا ہے، رشید احمد صدیقی نے ان کے شبیہ کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے زمانہ کی تمام ناکامیوں سے تھک کر فاروق جو اپنا تخلص دیوانہ رکھتے تھے، امام باڑہ ریاست کے پر آشوب دور میں منیجری کے بار گراں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور ریاست کو اپنی صلاحیتوں کی بنا پر کلفتوں سے باہر نکال لیا اس

کے علاوہ ریاست کی کارکردگی کو صرف مذہبی دائرے میں محدود نہیں
رہنے دیا بلکہ ملکی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، مسائل کے علاوہ غریب غرباء
کے معاش کو بھی اپنے مشن میں شامل کرلیا جس سے امام باڑہ کی
مقبولیت کافی بڑھ گئی، جہاں تک فاروق صاحب کی بصیرت کا سوال
ہے ان کا دماغ کھلی ہوئی ڈائری کے مانند تھا جس میں تمام معاملات یا
دداشت کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے، امام باڑہ کا کام بہت وسیع
ہوگیا، اس لئے انھوں نے اپنے صاحبزادے حامد عمر کو اپنے ساتھ لگالیا
مگر ملک کے بٹوارے کے بعد امام باڑہ اسٹیٹ کی حالت بالکل بدل
گئی فاروق صاحب کا سرمایہ دارانہ نظام نا کامیاب ہوگیا اور اسٹیٹ
تنزلی کی منزل کی طرف رواں ہوگئی''

فاروق صاحب کی شادی گورکھپور کے محلہ قاضی پور میں وزیر النساء بیگم سے
ہوئی تھی ان کا ننیہال بھی اسی محلہ کے شاہ عبدالرزاق صاحب کے وہاں تھا، ان لوگوں
نے گورکھپور کے محلہ پہاڑ پور میں حفظ کا ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسہ رزاقیہ تھا
جو گورکھپور میں اولیت کا درجہ رکھتا تھا۔

فاروق صاحب کے تین لڑکے اور غالباً دو لڑکیاں تھیں جو تقسیم ہند کے بعد
پاکستان منتقل ہوگئیں، ان کے بڑے لڑکے کا نام ابوالحسنات نور الدین احمد صدیق
مجنوں دوسرے کا نام ابوظفر جلال الدین حامد عمر اور سب سے چھوٹے لڑکے کا نام
ابوالبرکات رکن الدین محمد عثمان تھا، چھوٹے لڑکے کا انتقال نوجوانی میں ہوگیا، باپ
کی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ تینوں ادب نواز اور ادب شناس تھے، احمد صدیق جنھوں نے
اپنا تخلص مجنوں رکھا تھا دوسرے صاحبزادے بھی جن کا نام حامد عمر تھا شاعری کرتے
تھے اور وحشی تخلص رکھتے تھے، تیسرے صاحبزادے ابوالبرکات بھی اسی میدان کے
شہسوار تھے اور خبطی تخلص رکھتے ان تینوں شہسواروں میں کسی نے احمد صدیق مجنوں کی

ذہانت نہیں پائی تھی کیونکہ مجنوں میں اپنے باپ کی ادبی صلاحیتیں ضم ہوتی گئیں بقول فاروق صاحب

"امام باڑے کی منیجری سنبھالنے کے بعد علمی مشغلۂ زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا اور ادبی ذوق کی وراثت اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے صاحبزادے مجنوں گورکھپوری کو تفویض کر دی تھی، صرف تخلص اپنے حصے میں رہنے دیا"

لیکن جن دنوں وہ لکھا کرتے تو ارباب ذوق ان کے رشحات قلم کو بڑی دل چسپی سے پڑھا کرتے تھے، اپنے ابتدائی دور میں خفیہ طور پر (آئینہ) اخبار نکالتے تھے، جب وہ (ہمدرد) اور کامریڈ سے منسلک ہو گئے تو اس میں حاجی بلیغ العلیٰ اور حاجی بقلول کے نام سے اداریئے اور مضامین لکھا کرتے تھے ان کی کتاب (مطالعہ فطرت) ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی اور ۱۹۳۵ء میں ان کا (شیطان کا خطبۂ صدارت) کتابچہ شائع ہوا، گورکھپور کا ہفتہ وار اخبار (بیدار) ان کے گراں قدر مضامین سے بھرا رہتا تھا فاروق صاحب صرف نثر نگار ہی نہیں بلکہ شاعر بھی تھے ان کی یہ نظم ؎

اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے   پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

بہت مشہور ہوئی، کہتے بہت کم تھے مگر جب کہتے تو خوب کہتے، ان کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہو، ؎

کمال جذبہ تو دیکھو بہم تمیز مشکل ہے
وہ کہتے ہیں کہ پیکاں ہے میں کہتا ہوں میرا دل ہے
ادب سے میں حیا سے وہ لگاتے ہاتھ ڈرتے ہیں
نکل آئے تو پیکاں ہے جو رہ جائے مرا دل ہے

اس کے علاوہ بہت سی نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں اس طرح سے یہ عظیم الشان شخصیت کا زمانہ ۱۳؍ مئی ۱۹۶۸ء کو ختم ہو گیا، لیکن اپنے ادبی سرمایہ کو اتنے سلیقگی

سے اپنے بڑے لڑکے احمد صدیق کو منتقل کیا کہ وہ بیسویں صدی اردو ادب کے قد آور اور صف اول کے مشاہیرِ ادب میں گنے جانے لگے، مجنوں کی وسیع النظری نے اردو ادب کے ہر شعبہ میں قدم رکھا اور اپنی باکمال صلاحیتوں سے اس کو اس طرح درخشندہ کیا کہ وہ نصف صدی تک آسمانِ ادب پر چھائے رہے اور ان کی اچھوتی تحریروں نے ادب نوازوں کو ان کی انفرادیت کا احساس دلایا، ان کی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف نے ڈاکٹر اختر حسین کو یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ "ان کا یہ ادبی لگاؤ کارنامہ ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے"

ان کی اس عبادت نے ہماری ادبی دنیا میں ایک نئے باب کی ابتداء کی ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے علم وادب کا ایک عظیم شعور عطا کیا، برِصغیر کے بڑے بڑے نقادوں اور دانشوروں نے ان کی حق پرستی کو سراہا ہی نہیں بلکہ ہوا دی ہے،

۱۰ رمئی ۱۹۰۴ء کو سنت کبیر نگر کے چھوٹے سے موضع پلدہ میں فاروق دیوانہ کے گھر میں ایک چراغ روشن ہوا جس کا نام ابوالحسنات نورالدین احمد صدیق رکھا گیا مگر وہ احمد صدیق کے نام سے ہی یاد کیے جاتے ہیں، بدن کی ساخت کا عالم یہ تھا کہ جسم کی ہڈیاں گنی جاسکتی تھیں بقول ان کے والد۔

"وزن کسی بھی حالت میں دو پونڈ سے زیادہ نہ تھا، کمزوری کا یہ عالم کہ ماں کا دودھ نہ پی سکتے تھے اس لئے روئی دودھ میں ڈبو کر شکم سیری کی جاتی تھی"

مجنوں نے اپنے گاؤں کو جس نظریہ سے دیکھا اس کا ذکر اپنی کتاب (ادب اور زندگی) میں اسطرح سے کیا ہے۔

"میرا خمیر یقیناً یہیں کی خاک سے ہوا ایک دور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں پلدہ میں پیدا ہوا جہاں متمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بہت کم گزر ہوتا تھا جہاں بدویت اور بربریت کے جملہ علامات وآثار

اب تک اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح اب سے سو سال پہلے
پائے جاتے تھے'' ''مگر میری تربیت اور میرے مزاج و کردار کی
تعمیر بستی کے دوسرے موضع منجھریا میں ہوئی''

مجنوں ایک بہت نفاست پسند انسان تھے پلدہ کے قدرتی مناظر ان کو متاثر نہ
کر سکے اس لئے ان کو منجھریا زیادہ پسند آیا گو شکار اور گھومنے کی غرض سے پلدہ برابر
جاتے رہے، منجھریا میں ان کی زندگی کے گیارہ سال وہ قیمتی اوقات ہیں جس میں ان
کی دادی مرحومہ جو اس زمانے میں علوم و فنون سے اچھی واقف تھیں ان کے پرتو نے
مجنوں کو مجنوں بنانے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا
ہے، بقول مجنوں

''میری دادی گورکھپور کے ایک ایسے خاندان کی تھیں جو علم
و فضل اور درویشی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتی تھیں خود میری دادی بڑی
فاضل اور ادراک و بصیرت رکھنے والی ہستی تھیں میری تربیت انھوں نے کی
عربی اور فارسی، ہندی میں مجھے جو کچھ استعداد ہے وہ انھیں کی دین ہے''

منجھریا کے کھلے ماحول نے ان کے علمی شعور کو اور پروان چڑھایا وہاں کی
فضاؤں نے انھیں اشعار کہنے پر مجبور کر دیا مجنوں کا کہنا ہے کہ ان وادیوں میں جو
اشعار کہے وہ انھیں میں گم ہو کر رہ گئے، ۱۹۱۶ء میں بغرض تعلیم گورکھپور کے محلہ چھوٹے
قاضی پور میں منتقل ہو گئے اور ان کا نام مشن اسکول کے درجہ چھ میں لکھا دیا گیا اور ان
کی ادبی سرگرمیاں بڑھنے لگیں، شعر و شاعری کا نشہ اپنی شباب کا طرف گامزن تھا،
کچھ عرصہ بعد دادِ سخن کے لئے مشاعروں میں حصہ لینے لگے اور اپنا تخلص مجنوںؔ رکھا
بقول شوکت تھانوی

''معلوم نہیں یہ تخلص شعر کہنے کے لئے رکھا ہے یا اپنا تعارف
کرانے کے لئے''

مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے ان کی جسمانی نزاکت نے ان کو اور عریاں کر دیا ۱۹۱۹ء میں گورکھپور کے بینک کے عالی شان عمارت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مجنوں کی ملاقات فراقؔ سے ہوئی اس موقع پر فراق کے تاثرات ملاحظہ ہو۔

"اس مشاعرے میں ایک دبلے پتلے نوجوان نے بھی غزل پڑھی جس کی عمر بمشکل سولہ برس کی ہوگی، نہایت پر تکلف شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ ترکی ٹوپی، یہ تھی اس نوجوان کی پوشاک، کھلتا ہوا رنگ چہرے پر چیچک کے کچھ داغ، کشادہ پیشانی، اور آنکھوں میں کسی قدر چمک، جسم کی انتہائی لاغری کے ساتھ پورے جسم اور مختلف اعضاء میں ایک طرح کا برقی چنچل پن ایک سپاٹ انداز میں اس نوجوان نے پوری غزل سنائی، غزل کا یہ حال کہ شاید ہی کوئی مصرع ایسا رہا ہو جس میں چار اضافتوں سے کم کی ترکیبیں ہو، غلطی یا کچا پن یا کم مشقی کسی شعر میں بھی نہیں، ہر شعر سے ذہانت نمایاں اور شاعرانہ کاریگری بھی چابک دستی کے ساتھ جلوہ گر تھی"

مجنوں کی شاعری غالب اور بیدل سے متاثر رہی، مجنوں کا کہنا ہے کہ اگر دیوانِ غالب نیست و نابود ہو جائے تو میں از سر نو مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں، یہی نہیں مجنوں نے ایک جگہ یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ رومی کی مثنوی جس کو پہلوی زبان کا قرآن کہا گیا ہے، بیشتر حصہ پورے کے پورے یاد تھے۔

اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کو دیوان غالب اور مولانا رومؒ کی مثنوی پر کتنا عبور حاصل تھا، ان بزرگوں کے کلام کی مشکل پسندی کا احساس مجنوں کے کلام میں ہوتا ہے۔

لالہ و گل شرار ہیں نالۂ عندلیب کے
دیکھ فریب میں نہ شعبدۂ بہار کے

لکھا تھا اپنی قسمت میں جو یوں بے خانماں ہونا
تو دوشِ برق ہی پر چاہئے تھا آشیاں ہونا

ابتدائی دور کے کلاسوں میں ان کی ادبی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے استاد مولوی عبدالقدیر صاحب متاثر تھے اور گاہے بگاہے مختلف شعراء کے مصرع طرح دے کر ان سے غزل کہنے کی فرمائش کرتے تھے اس کا تفصیلی جائزہ پہلے باب میں لیا گیا ہے۔

مجنوں نے ۱۹۲۱ء میں سینٹ اینڈ ڈیوز کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس امید میں کہ ایک اچھا سائنس کا طالب علم بن سکتا ہوں اس کے علاوہ مختلف مضامین میں طبع آزمائی کرتے رہے اور ناکامی ہاتھ آتی رہی انھیں ناکامیوں کے دوران جبکہ پڑھائی متاثر تھی ان کے والد فاروق دیوانہ نے ۱۴/ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو احمد صدیق مجنوں کی شادی دختر مولوی محمد افراق کی صاحبزادی حمیرہ سے کردی، مجنوں ایک خوش مزاج اور باسلیقہ انسان تھے حالات کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتے تھے اس لئے ان کی ازدواجی زندگی ان کے لئے راحت کا باعث بن گئی، مجنوں کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی، ان کا بڑا لڑکا اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انتقال کر گیا اور تین لڑکے، ظفر عالم، قمر عالم، بدر عالم جو راحل تخلص رکھتے اور لڑکی تہمینہ جس کی شادی اقبال احمد انجینئر سے ہوئی تھی، مجنوں صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد جو بچے ان کے ساتھ رہتے تھے قمر عالم، تہمینہ، داماد اقبال احمد بھی وہاں منتقل ہو گئے، ظفر عالم جو انجینئر تھے وہ پہلے ہی سے پاکستان جا چکے تھے اور بدر عالم ان کے بعد پہنچے، افسوس کی بات ہے کہ مجنوں صاحب کی اولادوں میں صرف ظفر عالم اور قمر عالم رہ گئے باقی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مجنوں کی زندگی میں بہت سے طوفان اٹھے جس کو انھوں نے سر کرنے کی کوشش کی میٹرک پاس کرنے کے بعد جب تعلیم کے فروغ کے لئے کوئی راہ نظر نہیں آئی تو بادلِ ناخواستہ علی گڈھ کا رخ کیا اور ۱۹۲۷ء میں ادبیات اور فلسفہ کے ساتھ

ایف۔اے۔کا امتحان پاس کیا، والد کی بے گانگی اور بے توجہی کی وجہ سے ان کو گورکھپور واپس آنا پڑا اور بی۔اے کی تعلیم سنیٹ اینڈ ڈیوز کالج سے ۱۹۲۹ء میں پوری۔

مجنوں کو ایف۔اے، پاس کرنے میں دیر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ ان کے والد نے (کرگھہ) کا کاروبار شروع کیا تھا اس کی دیکھ ریکھ کے لئے مجنوں کو وہاں بٹھا دیا بقول فراق۔

''ایکبار میں نے مجنوں سے پوچھا کہ بھائی تمھارے والد صاحب نے جو کرگھوں کے کپڑوں کا کاروبار کیا ہے وہ کیسا چل رہا ہے، مجنوں کہنے لگے کہ جب تجارت میں تصوف کو دخل دیا جائے گا تو، کاروبار کا پھلنا پھولنا معلوم''

زندگی کے ناہموار راستے کو طے کرنے میں مجنوں کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی متحرک زندگی میں ٹھہراؤ نہیں تھا وہ اپنی باتوں کو قارئین تک مختلف صورتوں سے پہنچانا چاہتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے ایوان رسالہ کا سہارہ بھی لیا مگر زیادہ دور تک نہ جا سکے، جہاں تک تعلیم کا سوال ہے اس کو مکمل کرنے کے لئے آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں انگریزی سے ایم اے کیا اور ۱۹۳۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ان کے اس تعلیمی شعور نے ان کو اس بات کا احساس دلایا کہ اب ہمارے لئے درس وتدریس کی راہ ہی بہتر مشغلہ ہے جس سے ہم کچھ کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔

مجنوں میں سیمابی کیفیت بدرجۂ اتم تھی وہ کہیں ایک جگہ مستقل مزاجی سے نہ رہ سکے جولائی ۱۹۳۵ء میں وہ علی گڈھ کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہو گئے اور تعلقات عامہ کے سربراہ بنا دیئے گئے مگر حالات نے ساتھ نہیں دیا ماحول ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا اس لئے دسمبر ۱۹۳۵ء میں وہ گورکھپور آ کر اسلامیہ کالج میں انگریزی کے

استاد ہو گئے اور وہاں ان کا قیام جولائی ۱۹۳۶ء سے مئی ۱۹۳۷ء تک رہا، اسلامیہ کالج میں انھوں نے بہت سے ادبی کارنامے انجام دیئے بزم ادب کے جشن میں مشاعروں کا بھی اہتمام ہوتا، بیت بازی کے علاوہ تقاریر، خوش نویسی، مقالہ نگاری کے مقابلے ہوا کرتے یہ تمام مرحلے ایک رومانی فضا کالج میں پیدا کر دیتے مجنوں اس بزم کے صدر ہوا کرتے ۱۹۳۵ء کے مشاعرے میں جو نظم انھوں نے پڑھی تھی اس کا ایک شعر حاضرِ خدمت ہے۔

لیتے ہی دل پھیر لی مجھ سے نظر سچ ہے کہ جھوٹ
شکوۂ بیداد او بیداد گر سچ ہے کہ جھوٹ

بعد ازاں ۱۹۳۷ء میں مستقل طور سے سینٹ اینڈ ڈیوز کالج میں انگریزی شعبہ میں لکچرر اور اردو شعبہ کے صدر مقرر ہوئے، سینٹ اینڈ ڈیوز کالج میں مجنوں کا بڑا رعب ودبدبہ تھا، عیسائی ادارہ ہونے کے باوجود پرنسپل اور اساتذہ ان کا بڑا احترام کرتے، طالب علموں کا یہ حال تھا کہ جب وہ مجنوں کے پیر کی آہٹ سنتے تو خاموش کھڑے ہو جاتے یا آہستہ سے ہٹ جاتے، وہ عرصے تک آگرہ یونیورسٹی اکیڈمک کونسل اور سینٹ کے معزز رکن رہے انھوں نے کالج کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا، اپنی نازک بدنی کے باوجود مجنوں صاحب دور ہی سے پہچان لئے جاتے تھے، موسم کے لحاظ سے سفید یا کالی شیروانی اور تنگ پاجامہ زیب تن کئے، ہلکے فریم کی عینک لگائے، چھڑی لئے ہوئے سیدھے بالائی منزل پر اپنے کمرے میں پہنچتے جہاں عموماً اردو کے کلاس ہوا کرتے تھے، کلاس میں ان کی پابندی کی یہ حال تھا کہ جب تک سخت بیمار نہیں ہو جاتے کالج آنا بند نہیں ہوتا، کہتے تھے ''میں اپنی قوت ارادی سے زندہ ہوں جسے یہ قوت حاصل ہے وہ مر نہیں سکتا'' وہ کالج سے مستعفی ہونے تک لائبریری انچارج اور کالج میگزین کے منیجر اور چیف ایڈیٹر رہے وہ میگزین اردو سیکشن کی ترتیب خود اپنی نگرانی میں کراتے اور کلاس میں طالب علموں کو مضمون لکھنے کی تاکید کرتے۔

مجنوںؔ کی صلاحیت ان کی پرکشش شخصیت اورادبی رجحان کا نتیجہ تھا کہ اردو پر جب مصیبت کے بادل منڈلانے لگے تو طلبہ میں لگاتار کمی ہونے لگی تو مجنوںؔ نے اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے کے احکامات پاس کرائے اور انھیں کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۸ء میں گورکھپور یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہو گیا اور وہاں ان کو لکچرر کے عہدہ پر فائز کرنے کی گذارش کی گئی مگر مجنوں نے ریڈر سے کم کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، مجنوں کو اردو زبان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے منوہر کو لکھا تھا، لکھتے ہیں

"تم جانتے ہو کہ اردو میری زندگی رہی ہے اور رہے گی میرے لئے تو اردو.......... میں اردو کو ایک اتفاقی زبان یا ادیب نہیں سمجھتا جس میں ایک مصرعۂ طرح لیکر مشق کی جائے میں اردو کو ایک لٹریچر یا ہندوستانی تمدن کی ایک تواریخ یعنی ارتقائی صورت اور اس کی آئندہ ترقی کی ایک خوش آئند سمجھتا ہوں، لیکن اسی اردو کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ میری اور تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے، میں محسوس کر رہا ہوں اور بری طرح محسوس کر رہا ہوں کہ میری زندگی کے چند سال باقی ہیں اور میری ایک نیم آرزو یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو اپنی عمر کی باقی ماندہ سانسیں اردو کی خدمت اور اس کی تہذیب و ترقی میں صرف کر دوں تو تمھیں بتاؤں کہ موجودہ حالات و اسباب کے ہوتے ہوئے اس ملک میں جس کو تم سے زیادہ ہی شدت احساس کے ساتھ میں اپنا وطن سمجھتا رہا، اردو کا مستقبل کیا ہے، اور اردو کا کوئی مستقبل نہیں تو میرا ابھی کوئی مستقبل نہیں"۔ (پردیسی کے خطوط جلد اول ص ۱۱۵۔۱۱۶)

مجنوں صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ بی۔اے۔ کے انگریزی کلاس میں ٹہل ٹہل کر درس دیتے تھے مگر اردو کے کلاس میں بیٹھ کر پڑھاتے جب شعراء کے کلام پر

تبصرہ کرتے تو انداز تخاطب اتنا دلچسپ رہتا کہ دونوں کلاس کے طلباء بھرپور محظوظ ہوتے، اپنے لکچر کے دوران ادبا اور شعراء کے اچھائیوں اور کمیوں کو برمحل کہنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے، ان کی کوشش رہتی کہ ان سارے نکات کو جو ادب کو مجروح کر رہے ہیں آنے والی نسلوں کو بتا دیا جائے تا کہ اردو ادب کے لئے ایک ہموار راستہ تیار ہو سکے۔

مجنوں کا مادر درسگاہ علی گڈھ سے رابطہ اپنے والد اور خود ان کی ذات سے پیدا ہو چکا تھا وہاں سے ایف۔اے کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں چند ماہ شعبہ انگریزی میں لکچرر رہے اور بعد ازاں کرنل زیدی (وائس چانسلر) اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور کی دعوت پر سنیٹ اینڈ ڈیوز کالج سے مستعفی ہو کر نومبر ۱۹۵۸ء میں علی گڈھ پہنچ گئے۔

مجنوں جب تک سنیٹ اینڈ ڈیوز کالج میں رہے وہاں کے میگزین کے ناظم رہے اور اردو کے فروغ کے لئے وہاں ہر سال گرمیوں میں مشاعرہ ضرور کراتے تھے جس کے مہمان خصوصی فراق گورکھپوری ہوا کرتے تھے، علی گڈھ پہنچ کر اللہ والی کوٹھی میں قیام پذیر ہوئے، ان کی ابتدائی تقرری (تاریخ ادب اردو) اسکیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدہ پر ہوئی مگر یہ اسکیم عارضی تھی اس لئے شعبۂ اردو میں ان کی مستقل تقرری ریڈر کی پوسٹ پر ہوئی، اس وقت شعبۂ اردو کا چراغ عروج پر تھا اور ہندوستان کے باکمال اساتذہ درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے اس جھرمٹ کو ڈاکٹر محمد یٰسین نے دربار اکبری کے نورتنوں کا گمان کیا ہے۔

مجنوں کو ان کی مرضی کے موافق آب ہوا مل گئی تھی اس لئے اپنی گرمئی گفتار سے جا بجا مختلف نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے اور سامعین کو محظوظ کرتے، علی گڈھ تاریخ ادب اردو پہلی جلد شائع ہونے کے بعد جس ناخوشگوار ماحول میں بند ہوئی اس سے مجنوں کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگی اور وہ گورکھپور آنے کے لئے آمادہ

ہو گئے مگر علی گڈھ کے وائس چانسلر زیدی صاحب، طیب جی، اور نواب علی یاور جنگ نے ان کو پورب کا رخ کرنے سے باز رکھا گو علی گڑھ میں مجنوں نے بڑی شان وشوکت کے ساتھ دس سال کا وقفہ اپنے علمی کارگزاریوں میں گزارا مگر وہ اس بات سے رنجیدہ خاطر رہے کہ وہ جس مقصد کے تحت آئے تھے وہ پورا نہ ہوسکا اور اس حسرت نے ان کو پاکستان کی رنگین فضا دکھائی، قیام علی گڑھ میں اپنی دس سالہ زندگی کے دوران تنقیدی مضامین کے دو مجموعے (نقوش وافکار) اور دوش فرداں، شائع کیے اس کے علاوہ شیکسپیئر کا ڈرامہ "کنگ لیئر" کا اردو ترجمہ کیا اور ملٹن کی مشہور تمثیل کو شمسونِ مبارز، کے زیر عنوان اردو کی دھڑکن عطا کیا دوران قیام علی گڑھ میں ان کے پردیسی کے خطوط کا مجموعہ ان کی عزم واستقلال کی سلیقگی کا پتا دیتا ہے، یوں تو مجنوں کی تصانیف کی تعداد غالباً دو درجن سے کم نہیں ہے جس سے ان کی ادبی رجحان کا پتا چلتا ہے۔

میرے خاوند صدیق الرحمٰن صاحب کو دوران تعلیم مجنوں صاحب کی صاحبزادی تہمینہ کو پڑھانے کا شرف حاصل ہوا جس سے اس خاندان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، انھوں نے جوان کی پراسرار شخصیت بیان کی اس سے ان کی جمالیاتی کردار کا پتا چلتا ہے نازک جسم ذہین چہرہ، چوڑی پیشانی بڑی بڑی آنکھیں، اونچی ناک، گورا رنگ، شیروانی اور چوڑی مہری کے پاجامے میں ملبوس چھڑی لئے یونیورسٹی کیمپس میں نظر آتے ہیں، رات کو تین سیل کا ٹارچ چمبرلین کی چھتری کی طرح ان کی شخصیت کا جز ہو گیا تھا، مجنوں صبح کو اس وقت تک چادر سے منھ نہیں نکالتے جبتک ان کی لڑکی تہمینہ ان کو آ کر اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلاتی، چلنے میں مجنوں کا بایاں حصہ تھوڑا سا جھکا رہتا گلوریوں کی کثرت سے ہونٹ لال رہتے، اور بے جا گفتگو پر قطعی توجہ نہیں دیتے، مجنوں میں جہاں اتنی خصوصیات تھیں وہیں ایک منفی پہلو بھی تھا جس سے ان کا کردار مجروح ہوتا ہے، ان کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا اور مخالفت

برداشت کرنا جانتے ہیں نہیں تھے اس سلسلے کا ایک واقعہ بہت دل چسپ ہے کہ کی موضوع پر ان کی تکرار صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی سے ہو گئی بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مجنوں ذاتیات پر اتر آئے جس کی تصدیق اس وقت کے روزنامہ (قومی آواز) لکھنؤ سے ہوتی ہے، اپنے مجموعۂ مضامین (ادب اور زندگی) میں لکھتے ہیں۔

"میرے مزاج و کردار میں وہ ہمہ گیری، وہ فراخ دلی، وہ آزادی اور وہ حقیقت آشنائی آ گئی کہ مجھے بے باکی کے ساتھ کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ، اصلیت کو اصلیت اور فریب کو فریب کہہ دینے میں کبھی تامل نہیں ہوا اور میری زبان اور میرے قلم نے اس معاملے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی"

مجنوں کی ہمہ گیری شخصیت نے ان کو احبابوں میں بہت محبوب کر رکھا تھا وہ ایک وسیع المشرب انسان تھے، مجنوں کو رشتہ داروں دوستوں، عزیزوں، یہاں تک کہ وطن سے بہت لگاؤ تھا اور ہمیشہ اس کے پھلنے پھولنے کا خواب دیکھتے، مجنوں بھی اسکے قائل تھے کہ

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

وہ اشتراکیت پسند انسان تھے، نماز تو نہیں پڑھتے مگر دو چار روزے ضرور رکھ لیتے، مجنوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی کو بیوی، بچوں کی علت لاحق ہو جائے تو اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ خدا کو بھول کر اس کام کو اولیت کا درجہ عطا کرے کیونکہ خدا کا سامنا تو مرنے کے بعد ہوگا۔

علی گڑھ میں دس سال درس و تدریس کا کام کرنے کے بعد مجنوں صاحب جب مئی ۱۹۶۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تو ان کے سامنے سوائے پاکستان جانے کے اور کوئی راہ نہ تھی اس مرد مجاہد نے ایسی اضطرابی زندگی گذاری جو بہت کم ذی علم کو نصیب ہوتی ہے گھر چھوٹا، ملک چھوٹا، شہر چھوٹا مادر درس گاہ چھوٹی اور پاکستان

پہنچ گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو ہندوستان میں وہ مقام حاصل نہ ہو پایا جس کے وہ حقدار تھے، علی گڈھ میں بھی ناقدری نے ساتھ نہیں چھوڑا اور دلی یونیورسٹی کے انٹرویو میں ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا گیا، جس نے ان کو پاکستان کی راہ دکھائی، وہاں جانے کی وجہ ان کی لڑکی تحمینہ بھی بنی جس کو وہ دل و جان سے زیادہ چاہتے تھے، شادی کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئی، یہ شاق مجنوں کے لئے نا قابل برداشت تھا! واہ رے ہمت اور عزم کہ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، البتہ جب گاؤں چھوٹا تو چند اشعار ان کے گاؤں سے قلبی لگاؤ کا پتا دیتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

دفن تیری جھاڑیوں میں میرے دل کا راز ہے — تیری ہر موج ہوا میں میری ہی آواز ہے
تیرا ہو گوشہ کہ منزل گاہ الہامات ہے — مکتب عرفاں ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

مجنوں اپنے ۴۴ رسال کی عمر میں کراچی ہو آئے تھے اس وقت جو کراچی کا نقشہ کھینچا ہے، لکھتے ہیں۔

"میرا پہلا تاثر یہ ہے کہ کراچی خاک اور خچر کی سرزمین ہے"

(مشتاق احمد یوسفی مشمولہ' ارمغانِ مجنوں)

مجنوں کے کراچی کا ۱۹۶۷ء کا دورہ ان کے ارادے کی نقاب کشائی کرتا ہے، کیونکہ مجنوں علی گڑھ سے سبکدوش ہونے کے بعد مئی ۱۹۶۸ء میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ کراچی پہنچ گئے، کراچی میں پہلے ہی سے ان کا بڑا لڑکا ظفر عالم اور ان کا چھوٹا لڑکا بدر عالم موجود تھے، کراچی پہنچ کر ناظم آباد میں اپنے بڑے لڑکے ظفر عالم کے کشادہ مکان میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

مجنوں کو پاکستان پہنچنے کے بعد جو عزت نصیب ہوئی وہ کم لوگوں کو ملتی ہے مجنوں کو استقبالیہ سپاس نامہ اپنی جگہ ایک مثال ہے ان کو پروفیسر کی اعزازی ڈگری دی گئی اور کراچی یونیورسٹی سے ان کو منسلک کر دیا جہاں وہ ۱۹۸۷ء تک درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے، مجنوں کی پر کشش شخصیت نے بہتوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا

جس میں سے چند باکمال ہستیوں کا ذکر حسب ذیل ہے،

فراقؔ گورکھپوری مجنوں سے ملاقات کے بعد ہم نوالہ وہم پیالہ ہوگئے، مہدی افادی کی قربت مجنوں کو اپنے والد کی وجہ سے نصیب ہوئی، مجنوں کے خسر افراغ احمد کا شمار نستعلیق لوگوں میں ہوتا ہے ان کے توسل سے حسرتؔ موہانی اور ریاض خیر آبادی مجنوں کے حلقۂ احباب میں آگئے، مجنوں نے اپنی تحریروں میں جمیلہ بیگم کا جو مہدی افادی کی صاحبزادی تھیں کئی مقام پر ذکر کیا ہے، جمیلہ بیگم ایڈوکیٹ ذکی صاحب مرحوم کی اہلیہ تھیں اور ذکی صاحب کی بہن حمیرہ مجنوں صاحب سے منسوب تھیں بقول مجنوں۔

''جمیلہ بیگم کی صحبت نے میرے مزاج میں نفاستیں اور میرے دل گداختگی اور نرمی پیدا کی اور مجھے بہت آئشوں اور ناپاکیوں سے محفوظ رکھا، میرے کردار کی تہذیب وتشکیل میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے''

علی گڑھ میں ان کے والد کی شہرت اور مجنوں کی تحریری صلاحیتوں نے جن شخصیتوں کو ان کی طرف متوجہ کیا، اس میں رشید احمد صدیقی، وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین، کرنیل بشیر حسین زیدی، عبدالمجید قریشی قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ اساتذہ اور پروفیسروں سے بھی مجنوں کے اچھے روابط تھے، قیام لکھنؤ میں ان کے تعلقات نیاز صاحب جن سے ان کی ملاقات گورکھپور میں ہو چکی تھی ان کے علاوہ امتیاز صاحب، وصل صاحب، اور آگرہ میں میکش اکبر آبادی، محمود حسین رضوی، مخمور اکبر آبادی وغیرہ سے بھی روابط ہوگئے تھے، انجمن اسلامیہ گورکھپور کے سالانہ اجلاس نے بھی مجنوں کے تعلقات کو ہوا دی جس سے مجنوں کافی فیضیاب ہوئے۔

لاہور کی جن ہستیوں نے مجنوں کو اپنی شفقت ومحبت سے نوازہ اس میں حکیم احمد شجاع، ظفر علی خاں، عبد القادر، عبد العزیز صاحب پیش پیش ہیں، مجنوں کی ملاقات اقبالؒ سے بھوپال میں ہو چکی تھی مگر مجنوں نے اپنی زندگی میں اقبال کی شاعری کو وہ درجہ نہیں دیا جو میر وغالب کے حصے میں آئی وہ ان کو ایک ملی شاعر

گردانتے تھے جب مجنوں نے ہوش سنبھالا تو جوش ملیح آبادی کو اپنے سامنے پایا۔

مجنوں کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا مگر انھوں نے پرانی روایتوں سے رشتہ قائم رکھا تھا، مجنوں صاحب نے قیامِ گورکھپور کے دوران انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنا ڈالی تھی جس کے صدر شمیم مظفر پوری جو گورکھپور ریلوے میں ملازم تھے اور جنرل سکریٹری ملک زادہ منظور تھے، اس انجمن کا پروگرام گورکھپور کے مختلف محلوں میں ہوا کرتا تھا، جس میں شعراء اور نثر نگار برابر شریک تھے میزبانی کا فریضہ وہ ادا کرتا جس کی رہائش گاہ پر تقریب کا اہتمام ہوتا، مجنوں گورکھپوری اس انجمن کی خاص نشستوں میں بڑی تندہی سے شرکت کرتے مگر انھوں نے اس سلسلے میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، یہ وہ زینہ تھا جس نے مجنوں کو ترقی پسند ادیبوں کے درمیان پائداری بخشی اس لئے ان کی ملاقات ترقی پسند کے شہسواروں میں سردار جعفری، مجاز، جذبی، سجاد ظہیر وغیرہ سے تھی ان کے علاوہ ان کی ملاقاتیں جواہر لال نہرو، تاراچند، تعلیم الرحمٰن، اور امرناتھ جھا سے تھی اس طرح مجنوں نے قیامِ ہند میں اپنا ایک اچھا مقام بنالیا تھا اگر ادیبوں اور شعراء کو عزت دی تو اس سے کہیں زیادہ عزت پائی۔

مجنوں معاشی معاملات میں ہمیشہ کرب واضطراب میں مبتلاء رہے ان کی ہندوستان سے پاکستان تک کا سفر ان کی معاشی اور پراگندگی روزگار سے متصل تھے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ انسان تھے، زندگی کے تلخ حقائق کو پی جانے کی ہمت رکھتے تھے مگر ادبی کارناموں کی جستجو میں ہر قربانی قبول کرتے تھے، فراق نے ان کو اوتار سے تشبیہ دی ہے، گلنار کے نام لکھے ہوئے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''زندگی کی غلیظ کلفتوں کی تفصیل بیان کرنا میں گناہ سمجھتا ہوں ورنہ میں تم کو بتاتا کہ غلاظتوں کے گھور میں میں کس طرح ٹھوڑی تک دھنسا ہوا ہوں میری زندگی گندگیوں کا ایک جہنم ہے، جس میں کوئی لطیف یا جمیل کام نہیں کیا جاسکتا'' (ساتواں خط پریسی کے خطوط)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجنوں کی زندگی کتنی تلخیوں سے وابستہ تھی مگران کے چہرے سے ان کلفتوں کا اظہار نہیں ہوتا تھا وہ جانتے تھے کہ زندگی کی راہوں کو حوصلہ اور ہنس کر سر کرنے میں جو مزہ ہے وہ رو کر گذارنے میں نہیں ہے اس لئے ان کو شکست خورگی کا احساس نہیں ہوا ان کے خطوط ان کے قلبی واردات کے آئینہ دار ہیں زندگی کو مسلسل جدوجہد کا نام دے رکھا تھا،

۱۹۷۸ء میں جب مجنوں کچھ علیل ہو گئے تھے اور اسپتال سے گھر واپس آئے توان کے رفقاء اور قدر شناسوں کے علاوہ کراچی یونیورسٹی اردو کے اساتذہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مجنوں پچہتر سالہ زندگی میں داخل ہو چکے ہیں تو سب نے ہنگامی طور پر انٹر کانٹیبل ہوٹل میں مجنوں ی پلاٹینم جبلی منائی، اردو ادب کی تاریخ میں یہ جشن اولیت کا درجہ رکھتا ہے اس وجہ سے صہبا لکھنوی نے کراچی کو (شہر بیداد) کالقب دیا رئیس امروہوی نے (جشن بلوغ ادب) سے نوازہ، اس جشن میں مجنوں علالت کے سبب وہیل چیئر پر مع ان کی اہلیہ و جملہ خاندان کے ساتھ لائے گئے، پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے کان پڑے آواز سنائی نہیں دیتی تھی اسی دوران شبنم رومانی نے تعارف کرایا اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید نے ۷۵ رپھولوں کا سہرہ باندھنے کی رسم ادا کی اور نقد پندرہ ہزار روپے مہر معجّل ادا کی گئی اس دل ربا موقع پر جشن مجنوں میں لوگوں نے بڑی بیش بہا اور نایاب تقریریں کیں، صدر جشن ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی تقریر میں مجنوں کے (کارے کردم) کے مقولے کو حق بجانب بتایا ہے ہاجرہ مسرور کا کہنا بھی حق بجانب ہے کہ مجنوں کی صفات کو منٹوں میں سمیٹا جا سکتا ہے اور گھنٹوں میں بیان کیا جائے تب بھی ان کی شخصیت آبدار موتی کی طرح چمکتی نظر آئے گی، جشن کا لب ولباب یہ تھا کہ مجنوں صاحب کی تحریروں نے بہت سے لوگوں کے لئے روشن راہ فراہم کی اور وہ اندھیرے سے اجالے میں آگئے، رئیس امروہی نے جو غزل مجنوں کے شایانِ شان

پڑھی اس کے کچھ اشعار بھی سن لیجئے۔

مجنوں کہ اس کا جوشِ جنوں ہے کمال ہوش
اس شخص کو پیمبر روح ادب لکھو

من جملہ نوادر انشاء ہے اس کی ذات
روداد ذوق وشوق یہ لطف وطرب لکھو

اس پیر نوجواں کی یہ تقریب اے رئیس
جبلی نہیں ہے جشنِ بلوغِ ادب لکھو

قمر ہاشمی نے جو اپنی نظم فریم کرا کر مجنوں کو پیش کی اس میں انھوں نے مجنوں کو اوج ثریا پر پہنچانے کی کوشش کی ہے اس پلاٹینم جبلی کے موقع پر شائقینِ مجنوں نے اپنی تقریروں میں موصوف کی جو مدح سرائی کی ہے وہ اپنا انفرادی مقام رکھتی ہے، ڈاکٹر احسان رشید نے اپنی تقریر میں مجنوں کی حقیقت بیانی کا گن گایا ہے، اس کے علاوہ صاحب قلم اور دیگر ادیبوں کی طرف سے اکرام بریلوی نے مجنوں کی پچھتر یادگار تقریروں کا البم مجنوں کو پیش کیا اس سالگرہ کے موقع پر صاحب مجلس نے مجنوں اکیڈمی کے بنا ڈالنے کا اعلان کیا اس اکیڈمی نے مجنوں کے شائع شدہ اور غیر شدہ تحریروں کا یکجا کرنے کا عزم کیا، اور یہ بھی طے کیا گیا کہ پاکستان ٹیلی ویژن مجنوں پر پچاس منٹ کا پروگرام پیش کرے گا، اور پاکستانی فلم کمپنی نے مجنوں کے کارہائے نمایاں پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا اعلان کیا اور کراچی انتظامیہ نے ایک شاہ راہ مجنوں کے نام سے منسوب کرنے کی تجویز منظور کی، مجنوں نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا،

''عمر ہمیشہ آگے بڑھنے اور سیکھتے رہنے کی ہے اگر آدمی زندہ

ہے میں خود یہ کوشش کرتا رہا ہوں .... مرتا رہا لیکن مرنے سے
انکار کرتا رہا'' [1]

چونکہ مجنوں شکریہ کے قائل نہ تھے اسے اپنے تختی سے گرا ہوا لفظ سمجھتے تھے اس لئے اپنی تقریر کے اختتام پر شکریہ کی جگہ (مجھے اس بات کا فخر ہے) کا لفظ ادا کئے، اس جشن میں ہر کس و ناکس نے مجنوں کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں کیں۔

جیسا کہ ابتدائے عمر سے یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ مجنوں ایک ضعیف صحت کے مالک ہیں گورکھپور میں جب تک رہے ڈاکٹر مہدی کا علاج کیا کرتے تھے، جب بھی بیمار پڑتے لہری کے نسخوں کو اتنی ہی حفاظت سے رکھتے تھے اس میں یہ نوٹ ہوتا کہ یہ کس مرض کی دوا ہے،

صدیق الرحمٰن صاحب کا کہنا ہے کہ جب بھی وہ علی گڑھ میں بیمار پڑے اپنے نسخوں کے فائل سے ایسا نسخہ تلاش کر دیتے جس میں ملحق مرض کا ازالہ ہو جائے یہی چیز دھیرے دھیرے ان کی زندگی کو کمزور کرتی گئی اور آخر کار اپنے پچھتر سالہ عمر میں بستر سے لگ گئے، شبنم رومانی نے صحیح کہا ہے۔

''مجنوں صاحب نے بھرپور مجلسی زندگی گزاری ہے، وہ تمام عمر علمی، ادبی، تعلیمی، اور تہذیبی سرگرمیوں میں مؤثر طور پر شریک رہے ہیں مگر اب جب کہ صحت ان کے حوصلوں کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہے، نارتھ ناظم آباد کے ایک مکان میں کسی ملاقاتی کی گھنٹی کا انتظار ان کا بہترین شغل تھا'' [2]

ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ وہ اس شغل سے بھی معذور ہو گئے، مجنوں کے انتقال کی جب غلط خبر اخباروں نے چھاپی تو ہندو پاک کے بہت سے لوگ رنجیدہ

---

[1] (اگر آدمی زندہ ہے از مجنوں گورکھپوری مشمولہ ارمغانِ مجنوں صفحہ ۲۸۵ جلد اول)
[2] (مجنوں صاحب از شبنم رومانی مشمولہ ارمغانِ مجنوں صفحہ ۱۷۶ جلد دوم)

ہو گئے لیکن اخباروں نے اس خبر کی تردید کی تو بجھے ہوئے چہرے کھل اٹھے اور اللہ سے ان کی صحت اور زندگی کی دعائیں کرنے لگے، مگر یہ دعائیں بھی ایک منزل تک پہونچنے کے بعد واپس ہو جاتی ہیں اور زندگی موت سے ہار کر کناہ کشی اختیار کر لیتی ہے یہی حشر مجنوں گورکھپوری کا بھی ہوا، ۴/ جون ۱۹۸۸ء کو صبح سوا سات بجے کراچی پاکستان میں مجنوں کی روح ان کے خاکی جسم کو یہ کہتے ہوئے الوداع کہہ گئی۔

مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں کیا مجنوں ہم سا ہوگا

اس کے بعد ہر طرف سے مجنوں کی تعزیت نامہ کی گونج اٹھنے لگی اور ہر دل ان کی جدائی سے پاش پاش ہو گیا، مجنوں اپنے دور کے وہ آخری چشم و چراغ تھے جہاں پرانی تواریخ بند ہوتی ہیں اور نئی شاہراہیں کھل جاتی ہیں۔

جہاں تک مجنوں کی شخصیت کا سوال ہے شوکت تھانوی نے ان کو پاکٹ ڈکشنری سے تعبیر کیا ہے اور اردو کا انسائیکلو پیڈیا بتایا ہے، مجنوں کا کمزور جسم کڑاکے کی سردیوں میں بھی ایک گرم شیروانی سے زیادہ کا بوجھ نہیں برداشت کر پاتا، مجنوں نے جب سردی کا ذکر کیا تو منظر عباس نقوی کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی مجبوریوں کا اسطرح گلہ کیا کہ اُوَرکوٹ پہننے کی تجویز کا یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ "بھائی میرے شانے اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے"

احمد صدیق نے اپنا قلمی نام مجنوںؔ بہت سوچ سمجھ کر رکھا ان کا خیال تھا کہ یہ تخلص ابتک کسی نے نہ رکھا ہوگا مگر شومئی قسمت کہ دس سال بعد انھیں معلوم ہوا کہ فارسی زبان میں ایک مجنوں مشہدی سینکڑوں برس پہلے گزرے ہیں اور اردو میں بھی کسی مجنوں کے ہونے قیاس ہے، اور یہ تخلص واحد ان کی ذات سے منسلک نہیں ہے تو وہ بہت آزردہ ہوئے، یہ تخلص اتنا مشتہر ہو چکا تھا کہ واپسی ممکن نہ تھی، مجنوں اپنے کسی جگہ سے منسوب نہیں کرتے تھے گو ان کی پیدائش پلدہ بستی میں ہوئی اور تعلیم و تربیت گورکھپور کے محلہ چھوٹے قاضی پور میں پروان چڑھی مگر ان کے شعور نے اس بات کو

قبول نہ کیا کہ وہ کسی جگہ کے ہو کے رہ جائیں بقول مجنوں۔

''مجنوں تو میں ضرور ہوا لیکن یقین مانئے کسی ایک مقامی نسبت کا خیال دور تک میرے ذہن میں نہیں تھا اور اس کا الزام میرے سر نہیں آتا میں اپنے کو اس زمانے میں کسی مخصوص جگہ سے منسوب کر ہی نہیں سکتا''

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

مگر شومئی قسمت کو کیا کہئے مکتوبات کا آمد و رفت گورکھپور سے ہوا کرتا تھا اس لئے گورکھپور کا نام ان کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا اور لوگ انھیں مجنوں گورکھپوری کے نام سے جاننے لگے، مجنوں لکھنے پڑھنے کے بڑے گرویدہ تھے، پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھیں سوج جاتی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ میں اس کام کے علاوہ دوسرا کام نہیں کر سکتا ان کے مطالعہ اور تحریروں نے ان کی یادداشت کو وہ پختگی عطا کی کہ زمانہ دراز کی باتوں کو برمحل کہنے میں نہیں چوکتے۔ بقول مجنوں

''مجھے اپنے حافظے پر بہت اعتماد تھا''

ان کی قوت گویائی اور حافظے کی وہ سب لوگ قائل تھے جس سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی بقول سید سبط حسن

''جب میں مجنوں صاحب سے پہلی بار ۱۹۳۵ء میں ملا تو اندازہ ہوا کہ اس ڈھائی پونڈ کے شخص میں بلا کی توانائی پوشیدہ ہے، مجنوں صاحب نے صبح نو بجے بولنا شروع کیا اور شام چھ بجے تک لگاتار بولتے رہے''[۱]

ایک طرف مجنوں اپنے معاملات میں بہت صاف گو انسان تھے دوسری

۱۔ (مجنوں مجنوں لوگ کہتے ہیں، ارمغانِ مجنوں)

طرف ان کی بے پایاں محبت خلوص اور رحمدلی سے لوگ فائدہ اٹھالیتے تھے، پردیسی کے خطوط سے قارئین کو مجنوں کی حقیقی تصویر جلوہ گر نظر آئے گی وہ غربت وافلاس کی زندگی کو ایک ناپاک چیز سمجھتے تھے اور انسان کے لئے ایک کرب واضطراب کا ذریعہ محسوس کرتے تھے ان کے خطوط میں ان کی بصیرت، اونچ، نیچ کے تفرقے سے بے زاری صاف نظر آتی ہے، انھیں کوئی ذاتی غم تو نہیں تھا لیکن ان کے تصورات سے پتا چلتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے، ممتاز زمن صاحب نے ان کے طبعی عمر میں سوال کیا کہ آپ کے دل میں کوئی آرزو باقی رہ گئی ہے تو مجنوں نے عبرت گورکھپوری کا یہ شعر پڑھا۔

کسی کی آرزو پوری ہوئی کہاں جیتا رہوں میں انتہا تک

اور یہ ارشاد کیا کہ غربت کا اس دنیا میں قلع قمع کردوں پھر اطمینان کا سانس لوں مگر افسوس ایسا نہ کر سکا۔

مجنوں کی حاضر جوابی، مزاح اور گل افشانیاں بھی قابل قدر ہیں رومانیت ان کے رگ رگ میں سما چکی تھی، فراق نے مجنوں کے مزاج کو اسطرح سے ظاہر کیا ہے،

جب مجنوں علی گڑھ سے پروفیسر شپ چھوڑ کر چلے آئے تو فراق نے ان سے سوال کیا کہ علی گڑھ سے چلے کیوں آئے، تو مجنوں نے جواب دیا۔

"بھائی جہاں خالی مسلمان ہی مسلمان رہتے ہوں وہاں کسی کو پڑھنے لکھنے سے کیا غرض"

مجنوں ایک آزاد منش انسان تھے، نماز روزے سے دور کا واسطہ نہ تھا اور رسم ورواج کو معصیت سمجھتے تھے، ایک سادہ سپاٹ انسان تھے تصنع سے بہت دور اور مزاج میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا مگر ضدی بہت تھے سینما کے شوقین تھے، فراق گورکھپوری کے ساتھ اکثر وبیشتر سینما جایا کرتے تھے امراء اور افسروں کی دعوتوں میں بڑی گرم جوشی سے شامل ہوتے تھے اور اکثر انگور کی بیٹی کا استعمال بھی کر لیتے تھے، اور پھلوں کے مقابلے میں آم

مرغوب نہ تھا، کھانا بہت مختصر مگر انگریزی مزاج کا ہوتا، اچار کے گرویدہ تھے۔

مختلف لوگوں کی تحقیقات کے سلسلے میں مجنوں انفرادی رائے رکھتے تھے، کتابوں کے مقابلے کے سلسلے میں جب جب بات آئی انھوں نے اختر الایمان کی کتاب (یادیں) کو انعام کے لئے منظور کیا مگر کئی سال تک وہ منظور کرتے رہے اور کتاب انعام سے محروم رہی اور آخر کار ۱۹۶۸ء میں وہ انعام کی مستحق قرار دی گئی، اکیڈمی کے اصرار پر مجنوں نے اس کی رکنیت سے استعفیٰ بھی دیدیا۔

مجنوں کی وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ وہ کبھی بھی کسی کام کے سلسلے میں معاوضہ کے طلب گار نہیں ہوئے کیونکہ یہ ان کے وضع کے خلاف تھا، قیام کراچی میں انھوں نے نہ معلوم کتنے لکچر دیئے ہوں گے کتنے طلباء کو فیضیاب کیا ہوگا مگر اپنی جھولی کو سکہ رائج الوقت سے خالی رکھا، مجنوں دیکھنے میں آسان ضرور تھے مگر ان کے اس کمزور جسم میں بڑی پیچیدگیاں چھپی ہوئی تھیں، بقول شبنم رومانی،

> ''مگر مجنوں صاحب کو اتنا سہل بھی نہ جانو وہ آسان لوگوں کے لئے بہت آسان اور مشکل لوگوں کے لئے بہت مشکل آدمی ہیں'' [۱]

مجنوں نے جب جوانی میں قدم رکھا تو ان کی درجنوں عشق کی داستانیں گورکھپور کی فضاؤں میں گونج اٹھی مگر عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ مزاج میں سنجیدگی آتی گئی، ان کے عشق و محبت کی داستانیں ان کے اندر ہی دب کر رہ گئی تھیں کہ اس کے اثرات ان کے خطوط میں جا بجا نظر آتے ہیں،

مجنوں حسن پرست ضرور تھے اور حسن سے لطف اندوز ہوتے تھے مگر کبھی کسی گل کو پامال کرنا ان کی فطرت میں نہیں تھا، مجنوں دور اندیشی اور دور بینی کی صلاحیت رکھتے تھے وہ باشعور لوگوں کے صلاحیتوں کو خود میں ضم کرنے کا ہنر جانتے تھے، مجنوں اپنے خوب سمجھتے تھے کہ ان کا اصل مقام کیا ہے۔ بقول مجنوں،

۱۔ (مجنوں صاحب از شبنم رومانی ارمغانِ مجنوں)

"میری ابتدائی تعلیم و تربیت کچھ ایسی رہی کہ میرے مزاج و کردار میں وہ ہمہ گیری، وہ فراخ دلی، آزادی اور حقیقت آشنائی آگئی جس کی مثال آج تک مجھ کو اپنے عزیزوں، دوستوں اور ملاقاتیوں کے وسیع حلقے میں کسی دوسرے کے اندر نہیں ملتی" ۱

وہ انسان دنیا میں سب سے خوش قسمت سمجھا جاتا ہے جس کو قدرت کی طرف سے تین خوبیاں نصیب ہو جائیں، نمبر ۱/ اچھی رفیق حیات، نمبر ۲/ باوفا خادم، نمبر ۳/ محسن دوست، مجنوں کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں دو چیزیں تو ایسی مل گئیں تھیں جنھوں نے مر کر ساتھ چھوڑا جہاں تک دوستوں کا سوال ہے، جو مجنوں سے بہت قریب تھے جیسے فراقؔ، امر ناتھ جھا، نیاز، مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ وغیرہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ نکلا جس نے ان کی زندگی کی سرحد پار کرنے میں بھرپور مدد کی، اردو دنیائے ادب میں بیدلؔ اور انگریزی میں شیلیؔ نے مجنوں کو بہت متاثر کیا، مجنوں تو میرؔ کے چاہنے والوں میں سے تھے ہی مگر غالبؔ کی فلسفۂ حیات نے مجنوں کو اپنی طرف برمحل کھینچ لیا، غالب کی زندگی کرب و اضطراب کے ساتھ ساتھ حسن و مذاق کے آئینے میں ڈھلی ہوئی تھی، یہی خصوصیت ہم مجنوں کی ۸۴ رسالہ زندگی میں پاتے ہیں۔

مجنوں ہر ماحول میں گھل مل جانے کا گر جانتے تھے، بچوں میں بچے بن جاتے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے، مجنوں کی ادبی صلاحیتیں اس زمانے کے ادبی شعور سے مطمئن نہ تھیں وہ ادب کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے مگر ایسے نوجوانوں کی کمیابی تھی جو ادب کو جواہر پاروں کا درجہ عطا کرتے،

خود نوشت نمبر ۴/ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مجنوں سیاست کے میدان میں بھی دست رس رکھتے تھے وہ اپنے حامیوں کے ساتھ نکڑ سبھائیں کیا کرتے تھے اس کے علاوہ وہ قومی آزادی کی تحریک کے سلسلے میں اپنے ہمنواؤں کے

---

۱ (میں کیوں لکھتا ہوں، ادب اور زندگی، صفحہ ۲۳)

ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا کرتے تھے، وہ انگریزی زبان کے مداح ضرور تھے مگر انگریزی حکومت سے سخت نالاں تھے، مجنوں نے اپنے پرنسپل کی باتوں کا جس انداز سے جواب دیا اس سے ملک کی آزادی کی تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے، بقول ان کے،

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ بات بجا ہے کہ میں انگریزی زبان سے محبت اور اس کے کھانوں سے رغبت رکھتا ہوں مگر انگریزی سامراج سے مجھے بے حد نفرت ہے"

اس سلسلے میں مجنوں کا یہ شعر قابل ذکر ہے۔

نہیں غم سر کے کٹنے کا کہ اطمینان ہے قاتل　　مذاقِ سرفروشی ہے تو پھر کرلیں گے سر پیدا

مگر ازدواجی زندگی نے انھیں ان سارے کاموں سے دور کردیا، مجنوں کی یہ دلی تمنا تھی کہ اردو ادب میں ایسی راہیں ہموار ہوجائیں جو اس ادب کو انگریزی ادب کے مقابلے میں کھڑی کرسکیں مگر یہ ایک خواب ان کی زندگی کی بچی ہوئی چند سانسیں پورا نہ کرسکیں، پلدہ (بستی) کی سرزمین سے اٹھا ہوا خمیر بچپن منجھریا کے نذر ہوا تعلیمی شعور گورکھپور کے درس گاہوں نے عطا کی، غلامی دیکھی، جوانی کی سرحدوں سے جب پار اترنے لگے تو آزادی نے قدم چومے، ملک کا بٹوارہ ہوچکا تھا، یہ ملک کا بٹوارہ نہ تھا بلکہ دلوں کا بٹوارہ تھا، تہذیب وتمدن بھی بٹ گیا، انسانیت مجروح ہوگئی، مجنوں کا کہنا تھا، کہ ایسے ماحول میں انھوں نے اپنے تخلیقی اُپج کا دم گھٹتا ہوا پایا، مجنوں نے ملک وقوم اور ادب کی صحت مندی کا خواب دیکھا تھا وہ تو ان کی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا بلکہ خواب بن کر رہ گیا ناتواں جسم نے ترقی کی ہر سعی کی مگر حالات نے پیش بندی کردی اور انھیں الجھاؤ نے زندگی کو فنا کی راہ دکھادی۔

مجنوں نے جو اپنے تاثرات کو اپنی کتاب (ادب اور زندگی) کے صفحہ ۲۰۹ پر پیش کیا ہے وہ حقیقت سے پرے ہے اور ان کی خوش فہمیاں ہیں جس کو انھوں نے

اپنے دل میں بٹھا رکھا تھا، مجنوں ہر اس چیز کو چاہے کتنی چھوٹی یا نحیف ہو اگر ان کی نظر کو بھا گئی تو اس کے بارے میں لکھنے سے چوکتے نہیں تھے، گورکھپور کی واحد لائبریری جو بہت قدیم تھی لیکن اس کا شیرازہ واحد مرحوم کے بعد بکھر گیا اس سلسلے میں انھوں نے واحد صاحب کو جو شکریہ ادا کیا تھا وہ حسب ذیل ہے،

''واحد علی ہاشمی صاحب بانی و مہتمم واحد لائبریری گورکھپور کا شکریہ مجھ پر عرصہ سے واجب ہے جس کو آج میں ان سطروں میں ادا کر رہا ہوں واحد صاحب کی ذات گورکھپور جیسے مقام کے لئے بہت غنیمت ہے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو بغیر ریا و نمائش کے خاموشی اور بے غرضی کے ساتھ مصنفوں اور ان کی تصنیفوں سے شغف رکھتے ہیں کتابیں جمع کرنے کا شوق واحد صاحب کو ایک مدت سے تھا اور وہ چپ چاپ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اس شوق کو پورا کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے پاس ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا اور یہ انھیں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج واحد لائبریری جیسا وقیع اور باحیثیت کتب خانہ اور دار المطالعہ گورکھپور میں موجود ہے مجھے جب کبھی اخبارات و رسائل سے لے کر اپنے مضامین یا افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع کرنا ہوا ہے یا اپنی کتاب کا کوئی دوسرا ایڈیشن نکالنا ہوا ہے تو واحد ہی صاحب کی طرف رجوع کرنا پڑا اس لئے خود میرے پاس کبھی میری تصنیفیں محفوظ نہیں رہیں واحد لائبریری سے مجھے ہمیشہ اس معاملہ میں مدد ملی جس کے لئے واحد صاحب کا ممنون ہوں'' [۱]

مجنوں اپنے دوستوں، ہمدردوں اور ثنا خواہوں کے خطوط کے جواب میں کوتاہی نہیں برتتے تھے، اس سلسلے میں مجنوں کے خطوط تو نہ مل سکے البتہ ایک خط سردار

---

۱ (مریم مجدلانی)

جعفری کا مجنوں کے نام مل گیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے مجنوں کو کتنا لگاؤ تھا سردار جعفری کا خط بنام مجنوں گورکھپوری، کی عبارت اس طرح سے ہے،

''قبلہ مجنوں صاحب تسلیم

آپ کی مختصر تحریر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی، خدا آپ کو تادیر زندہ اور سلامت رکھے، ایک عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی ہے، ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، اب پاکستان کی طرف آنا ہو تو ملاقات کی صورت نکلے، آپ کا ۲۶ر دسمبر ۷۸ء کا خط اور قمر عالم کا تفصیلی خط مجھے آخری جنوری میں کانپور میں ملا تھا، ظہیر صاحب نے بمبئی بھیج دیا تھا وہاں سے کانپور آیا اس وقت تک اس خبر کی تردید ہو چکی تھی جو غلطی سے آپ سے متعلق شائع ہو گئی تھی پھر بھی میں نے آپ کے خط کی نقل ''قومی آواز'' لکھنؤ کو بھیج دی تھی، اس کے بعد میں مسلسل سفر کرتا رہا، اب بمبئی واپسی ہوئی تو آپ کا ۶ر مارچ کا تحریر کیا ہوا خط ڈاک سے موصول ہوا حیرت ہے کہ آپ کو میرا خط نہیں ملا جو پہلے خط کے جواب میں وسط فروری میں ارسال کیا تھا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ''ہزار فاصلے حائل ہیں فاصلوں کے سوا''

—— میں اچھی طرح ہوں، سلطانہ بھی بخیرت ہیں اور آپ کی خدمت میں سلام عرض کر رہی ہیں، اس عمر میں جی چاہتا ہے کہ ایسے حالات ہوں کی سکون سے زندگی بسر کی جا سکے، جی چاہے تو لکھوں، جی چاہے تو نہ لکھوں، لیکن یہ فراغت اور عیش کہاں ممکن ہے، ابھی تک روزی کمانے کی جدو جہد جاری ہے، شام کو پانی پینے کے لئے دن بھر کنواں کھودنا پڑتا ہے۔

ادھر میری کوئی نئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے سات آٹھ سال

ہو گئے ہیں دو کتابیں تیار ہیں، مگر نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی، مکروہاتِ دنیا میں مبتلا نہیں ہوں، دراصل مکروہاتِ دنیا نے گھیر رکھا ہے، اتنے عرصے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں تو کوئی سوغات تو پیش کرنی چاہئے، تین چار معمولی سے شعر ارسال کر رہا ہوں، ان کی خوبی بس اتنی ہے کہ نئے ہیں

ہوسِ دل ہے کہ رقصِ مہ و سال اور ابھی
لطف معشوقۂ خورشید جمال اور ابھی

در ابھی بند نہ ہو شوق کے میخانے کا
جامِ جم اور ابھی جامِ سفال اور ابھی

اک غزل اور کسی دشمن جاں کی خاطر
وہی آتش کدۂ ہجر و وصال اور ابھی

بس نکھرنے ہی کو ہے درد کے شعلے کا جمال
چشمِ مظلوم میں تھوڑا سا جلال اور ابھی

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے

آپ کا

سردار جعفری ۶/اپریل ۱۹۸۸ء

مجنوں علم وادب کے اتنے رسیا تھے کہ کوئی بھی ذی علم مل جاتا یا کسی کے گھر کتابوں کا ذخیرہ ہوتا تو وہاں وہ جانے سے نہیں چوکتے شاہد علی سبز پوش جو گورکھپور کے جانے مانے رئیسوں میں تھے علم وادب کے مداح ہی نہیں بلکہ شاعر بھی تھے اور فانی تخلص رکھتے تھے، مولوی سبحان اللہ صاحب جو رئیسِ گورکھپور تھے ان سے انکا قریبی رشتہ تھا ایک بہت اچھی لائبریری قائم کرلی تھی مجنوں صاحب بلا ناغہ شاہد

صاحب کے مکان جس کا نام دارِ فانی ہے پہنچ جاتے اور فانی صاحب سے تمام دن علمی گفتگو میں مصروف رہتے، دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتے یہی نہیں بلکہ ایک بار ایک نشست نواب زادہ علی کبیر کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی موسم بہت خراب تھا مجنوں نے اپنی کمزوریٔ صحت سے مشاعرہ میں جانے سے انکار کر دیا مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ گورکھپور کے مشہور شاعر رنگ بہادر لال جگرؔ اپنی علالت کے باوجود باہر کار میں بیٹھے ہوئے ہیں تو مجنوں اپنی حساس طبیعت کو روک نہ سکے اور اسی حالت میں کار میں آ کر بیٹھ گئے اس اردو ادب کے شیدائی کو جب بھی ادب کی خدمت کا موقع ملا اس نے اپنی محبوبیت کا بھرپور اظہار کیا مجنوں تو نہیں رہے مگر آج بھی گورکھپور کی فضاؤں میں ان کی اردو ادب سے والہانہ لگاؤ کا چرچا رہتا ہے۔

مجنوں کی شخصیات پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی کی باتیں جو انھوں نے رسالہ (دائرے) میں لکھے ہیں قابل ذکر ہیں،

> "مجنوں صاحب کی تحریروں اور شخصیت میں جو تازگی اور زندگی ہے اس کی روشنی میں کوئی بھی یہ یقین نہیں کرسکتا کہ ان تحریروں کو لکھنے والا اور ایسی دلنواز شخصیت کا حامل انسان بھی مر سکتا ہے،
>
> مجنوں جو مر گیا تو جنگل اداس ہے" [۱]

---

[۱] ماہنامہ (دائرے) ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۳

(۴)

مجنوں کی شاعری

(باب دوم)

مجنوں گورکھپوری کی شاعری

نہ شعر ہے نہ ترانہ نہ داستان مجنوں
شکستِ دل کی صدا ہے سنا رہا ہوں میں

احمد صدیق مجنوںؔ دبستان گورکھپور کے وہ درخشندہ ستارے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے مختلف اصناف میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں، وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی اردو شاعری کی طرف راغب تھے اس کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجنوں کا بچپن ادب نواز اور ادب شناس شخصیتوں کے درمیان گذرا، مجنوں کو مجنوں بنانے میں ان کی دادی کا بڑا ہاتھ تھا، وہ ایک روشن خیال یا صلاحیت اور ادب شناس خاتون تھیں، دوسری شخصیت جس نے ان پر اپنا پرتو ڈالا وہ ان کے منجھلے دادا محمد اسحٰق صاحب تھے جو منقولات اور معقولات پر یکساں دست رس رکھتے تھے مجنوں کو اس بات کا پاس تھا کہ وہ ایک پڑھے لکھے ددھیال سے تعلق رکھتے تھے،

مجنوں کو شاعری کی طرف رجوع ہونے کی دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ پیدائشی طور پر بہت کمزور ان کا جسمِ ناتواں کھیل کود کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھا۔

ابتدائی دور میں وہ منجھریا ضلع بستی کے پر فضا ماحول میں اپنے تخیلات کو پروان چڑھا رہے تھے، ان کی جسامت اور وضع قطع دیکھ کر آج بھی منجھریا کے بزرگ لوگ یہ شعر دہراتے ہیں، بقول نور گورکھپوری۔

جھر جھر جھر جھر نالہ بہے مجنوں کھڑے نہائیں
کوٹھے سے لیلیٰ جھانکے کہیں مجنوں بہ نہ جائیں

اس شعر سے آپ ان کی جسمانی ناتوانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مجنوں کی علمی صلاحیت اور منجھریا کے پر فضا ماحول نے انہیں اشعار کہنے پر مجبور کیا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے قیامِ منجھریا میں بھی بہت سے اشعار کہے ان کے نقوش نہیں ملتے، مجنوں صاحب خود کہتے تھے کہ ان وادیوں میں جو اشعار کہے وہ انھیں میں گم ہو کر رہ گئے، بقول مجنوں

"میں نے کس عمر سے شعر کہنا شروع کیا یہ بتانے کی ضرورت نہیں، بس یہ جان لیجئے کہ عربی اور فارسی اور ہندی میں پوری استعداد حاصل کر لینے کے بعد جب ۱۹۱۶ء میں ۱۲ سال کی عمر میں داخلہ گورکھپور کے مشن اسکول کی چھٹی جماعت میں ہوا تو میں ایسے اشعار کہہ رہا تھا کہ اسکول کے اساتذہ جو شاعری کا ذوق رکھتے تھے نہ صرف خوش ہوتے تھے بلکہ میرے کسی شعر میں کبھی کوئی عیب نہیں پاتے تھے، ساتویں جماعت سے دسویں جماعت تک جب کوئی نیا استاد آیا یا کوئی استاد اسکول چھوڑ کر جانے لگا تو استقبالیہ یا الوداعی قصیدہ مجھ سے کہلوایا گیا" [۱]

تعلیم کے سلسلے میں جب مجنوں کے آباء واجداد گورکھپور محلہ چھوٹے قاضی پور میں منتقل ہوئے اور ان کا نام مشن اسکول درجہ چھ میں لکھا گیا اس وقت ان کی عمر بارہ

---

[۱] (خود نوشت نمبر ا ارمغانِ مجنوں جلد اول صفحہ ۴۴)

سال کی تھی ان کے استاد مولوی عبدالقدیر صاحب مجنوںؔ کی ادبی صلاحیت سے متاثر تھے، انھوں نے مجنوں کو انشاءؔ کا مصرع طرح دیا اور غزل کہنے کی فرمائش کی، مصرع ہے۔ ع

وہ نامِ خدا سر سے ہیں تا ناخنِ پا گرم

مجنوںؔ نے اس مصرع پر گرہ لگا کر اسے مطلع بنا دیا، دیکھئے۔

وہ نامِ خدا سر سے ہیں تا ناخنِ پا گرم
اک رات بھی لیکن میرا پہلو نہ کیا گرم

مجنوںؔ نے اس پر پوری غزل کہہ ڈالی جس کے دو اشعار حسب ذیل ہیں

اے شیخ علاج آپ کا عشق ہے یا مئے
بلغم کی ہو افراط تو دیتے ہیں دوا گرم
برسوں کی ریاضت کا ثمر ہے یہ مساوات
یکساں ہے میرے واسطے کیا سرد ہو کیا گرم

مگر وہ ایسے اشعار کہنا پسند نہ کرتے تھے، بقول مجنوں

"ایسے اشعار کہہ کر ہمیشہ لاحول پڑھا کرتا تھا"

اسی طرح مولوی صاحب مجنوںؔ کو دبستانِ لکھنؤ کی مشکل زمینوں پر اشعار کے مصرعے دیتے تھے اور مجنوںؔ ان پر غزل کہنے میں یکتا ثابت ہوتے تھے مگر ان کی یہ طرز پسند نہ تھا،

مولوی صاحب نے ان کو اقبالؔ کا یہ شعر ؎

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

غزل کہنے کے لئے دیا مجنوں نے امیر و داغ کے طرز پر غزل کہہ ڈالی جس کے دو شعر ملاحظہ ہو،

کوئی دیکھے تو مے نوشوں نے کیا جوہر نکالے ہیں
سنا تھا حضرتِ مجنوںؔ بڑے اللہ والے ہیں
کہیں ہم نے بھی کل مجنوں کو دیکھا واہ کیا کہنا
بڑے اللہ والے ہیں بڑے اللہ والے ہیں

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مجنوں میں یہ اہلیت بدرجہ اتم تھی کہ وہ اردو کے استاذوں کی زمین پر غزل کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور جابجا انھوں نے اس صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے،

میرؔ پر جو گزری اس کی سرگذشت ان کے اشعار خود ہی ہیں یہ اور بات ہے کہ کسی کو ان کے جان لیوا غم کا احساس پہلے ہوا، کسی کو بعد میں، مجنوںؔ بھی میرؔ کو خدائے سخن سمجھتے تھے مگر وہ ان کے دروازے تک غالبؔ اور بیدلؔ کے بعد پہنچے، مجنوںؔ غالبؔ کی شاعری سے بہت متاثر تھے، لیکن میرؔ کے غمِ جاناں اور غمِ روزگار نے بھی ان کو کافی متاثر کیا ۱۹۲۱ء کے مشاعرے میں میر کا یہ مصرع بطور طرح دیا گیا۔ ع

ہوگئی شہر شہر رسوائی

اس سلسلے میں مجنوں نے جو غزل کہی اس پر غالب کا رنگ چھایا ہوا تھا ملاحظہ ہو۔

یا ہمہ جشن عالم آرائی زندگی انتظار وتنہائی
آبلہ پا آبلہ بردوش زندی اپنا بوجھ اٹھا لائی
یک تیری آرزو تو ہے وحشت ورنہ فرزانہ ہوں نہ سودائی
برگ وریزاں ہے یا بہاراں ہے ہر کلی کھلتے کھلتے مرجھائی
کون پھر کس کا انتظار کرے
عشق آوارہ حسن ہرجائی

غزل کے ان اشعار میں مجنوںؔ کی عشقیہ شاعری کی جھلک ملتی ہے انھوں نے مومنؔ کی زمین میں بھی غزل کہی ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں

ابھی حسن نواز تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ابھی آرزو کی تھی ابتدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ شعور حسن کا ارتقاء وغرورِ حسن کی ابتداء
وہ عروج نشہ شوق کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ خروش ولولۂ ستم، وہ نشاط حوصلۂ الم
وہ جواں دلوں کا معاملہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مجنوںؔ نے ان اشعار میں داخلی جذبات کو بے حد مترنم اور دل نواز لہجہ میں ادا کیا ہے الفاظ کی بندش کے ساتھ ساتھ عشق کی ابتداء وانتہا کی بہترین عکاسی کی ہے، مجنوں چونکہ ماہر ادب تھے اس لئے الفاظ کی بندش کے ساتھ ساتھ اس کی نزاکت پر بہت دھیان دیتے تھے جس سے ان کے کلام میں بڑی بالیدگی آجاتی ہے اس شعر پر غور کیجئے،

آشنا ہو جو لبِ گوش سے وہ راز نہیں
میں وہ نغمہ ہوں کہ جسکی کوئی آواز نہیں

یہ شعر غالب کے اس شعر سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب کا یہ شعر یاسیت کا شکار ہے جب کہ مجنوں کا شعر خاموش شکستگی کا پیامبر ہے، ڈاکٹر مسعود حسن نے اردو کے ارتقاء میں غزل کی تشریح کرتے ہوئے صفحہ ۱۸ پر لکھا ہے۔

"غزل ایک لسانیاتی عمل اور فن ہے اس کے فنکار پر اجتہاد واختراع کا فرض بھی عائد ہوتا ہے"

اس سلسلے میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''کسی بھی شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ غزل کے
محدود دائرے میں رہ کر جولانی طبع دکھائے، چاول پر قل ھو اللہ لکھے،
قطرہ میں دجلہ ڈھونڈھے اور آنکھوں کے تل میں آسمان دیکھے''

یہ بہت مشکل اور ٹیڑھا سفر ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے بڑے بڑے استادوں نے بڑی بڑی کاوش کی ہیں تب جا کر ان کی غزلیات میں وہ جاذبیت پیدا ہوتی ہے جو روح میں اترنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اشعار میں وہ پختگی، تڑپ، سچائی اور حقیقت پیدا ہو جاتی ہے جس کی مثال آپ کو میرؔ، غالبؔ، اور اقبال کے یہاں برملا ملے گی،

مجنوںؔ چونکہ بیدلؔ اور غالبؔ کے پرستاروں میں سے تھے اور اردو ادب پر اچھی دست رس رکھتے تھے اس لئے جتنے بھی اشعار کہے اس کی بندش میں کہیں سے کمزوری نہیں ملتی، ۱۹۱۹ء میں گورکھپور کے مقامی مشاعرے میں مجنوں نے جو غزل سنائی اس پر فراق کے تاثرات حسب ذیل ہیں،

''غزل کا یہ حال کہ شاید ہی کوئی مصرع ایسا رہا ہو، جس میں
چار اضافتوں سے کم کی ترکیبیں ہوں، غلطی یا کچا پن، یا کم مشقی کسی بھی
شعر میں نہیں ہر شعر سے ذہانت نمایاں اور شاعرانہ کاریگری بھی پوری
چابک دستی کے ساتھ جلوہ گر تھی''[1]

مجنوںؔ کی اس غزل کا صرف ایک مصرع دستیاب ہوا جس سے ان کی شاعرانہ اہلیت کا پتا چلتا ہے، ع

مٹے ساماں طراز نازش ہندوستاں ہو کر

مجنوںؔ کی غزلیات میں غزل کے فن کی ترجمانی پائی جاتی ہے، ہم آپ کو مجنوںؔ کے ان اشعار کی طرف لے چل رہے ہیں جو ان کے ۱۶ اور ۲۰ ر کے سن کے ہیں کلام

---

[1] (مجنوں گورکھپوری حیات اور ادبی خدمات ڈاکٹر شاہین فردوس صفحہ نمبر ۳۱۰)

میں پختگی ہے اشعار میں سلیقہ، بندش اور خیالات میں نزاکت ہے ملاحظہ ہو،

سن اے مطرب نواز تھی یہ کب کی سنی ہوئی آواز
پائے وحشت خرام بسم اللہ کب تک اندیشۂ نشیب وفراز
لالہ وگل شرار ہیں نالۂ عندلیب کے
دیکھ فریب میں نہ آ شعبدۂ بہار کے

لکھا تھا اپنی قسمت میں جو یوں بے خانماں ہونا
تو دوشِ برق ہی پر چاہئے تھا آشیاں ہونا
مجھے وفا سے کیا غرض؟ بندۂ رضا ہوں میں
وفا سے آپ کو ضد ہے تو بے وفا ہوں میں
وہ ایک رنگ حقیقت حقیقتِ نیرنگ
فریب عالم صورت کو جانتا ہوں میں
نہ شعر ہے نہ ترانہ نہ داستان مجنوں
شکستِ دل کی صدا ہے سنا رہا ہوں میں

کہہ دو ہنگامۂ محشر سے کہ خاموش رہے
ہوک اٹھتی ہے میرا درد سوا ہوتا ہے
اس قدر جامہ سے باہر ہے ترا زندانی
آج زنجیرِ عناصر سے رہا ہوتا ہے

گورکھپور کے ۱۹۲۰ء کے مشاعرے میں داغؔ کا یہ مصرع بطور طرح دیا گیا ع
"میری جان چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے"
جس میں (دل) اور (مشکل) کے قافیوں کے ساتھ لازمی کر دیا گیا

مشاعرے کی یہ مشکل شرائط شعراء کے لئے بھاری پڑتی تھیں مگر مجنوںؔ کبھی بھی ان شرائط سے خائف نہیں ہوئے اور برجستہ اشعار کہتے تھے گوسنگلاخ زمین ہونے کی وجہ سے اس ردیف پر صرف پانچ شعر ہی کہہ سکے جسکے تین شعر حسب ذیل ہے،

نہ ہوتی ہے محبت اور نہ کوئی دل سے ملتا ہے
ملے جو بے غرض ایسا بڑی مشکل سے ملتا ہے
فنا ہو یا بقا سب ہیں مقاماتِ سفر ہمدم
یونہی راہی کو منزل کا پتا منزل سے ملتا ہے
بھنور میں ڈوبنے والے بھی ساحل تک پہنچتے ہیں،
بھنور کا بھی تو آخر سلسلہ ساحل سے ملتا ہے

ایک اچھے شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فن اور مواد دونوں کی اس طرح پیش کرکے کہ اشعار میں خیال اور اسلوب دونوں کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے مجنوںؔ نے اس خصوصیت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، فانیؔ کے اس شعر کے خیال کو مجنوںؔ نے دوسرے انداز سے باندھا ہے،

فصل گل آئی، یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
فانیؔ

مجنوںؔ نے اس کو اسطرح کہا ہے،

کس قدر جامہ سے باہر ہے تیرا زندانی
آج زنجیر عناصر سے رہا ہوتا ہے

اس شعر کی بندش اور الفاظ کا برمحل استعمال مجنوںؔ کی ذہانت کی غمازی کرتا ہے مجنوںؔ میں شعر کہنے اور شعر کی حقیقت سمجھنے کا جوہر تھا مگر اس زندانی نے اردو شاعری کی راہ چھوڑ کر نثری ادب میں اپنا قدم رکھا اور بڑی کامیابی حاصل کی اس لئے ان کا کوئی

مجموعۂ کلام منظر عام پر نہیں آسکا، بہر کیف جو بھی اشعار مختلف روابط سے ملے ہیں ان سے مجنوں کی شعری صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

گرداب نے یہ کس کا سفینہ ڈبو دیا
موجیں ہیں بے قرار تو ساحل اُداس ہے

لالۂ وگل پھر فریب رنگ بو دینے لگے
زخم ہائے دل ابھر کر پھر لہو دینے لگے

مرتے دم تک زندگی میں اک کمی پاتا رہا
اس کو کیا سمجھوں اگر تیرا تمنائی نہ تھا
خود بخود آخر غم دوری گوارہ ہوگیا
کہتے کس منھ سے کہ یارائے شکیبائی نہ تھا

عشق کا آغاز ہی آئینہ انجام ہے
صورت شمع سحر دھندلا چراغ شام ہے
اے دل راحت طلب اے عافیت نہ آشنا
کہتے ہیں راحت جسے وہ موت کا پیغام ہے

مجنوں کے یہاں دلی کیفیات کا ایسا اظہار ملتا ہے جس میں میر کے سوز وگداز کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں،

مجنوں نے اپنی شاعری میں ترقی کی علامتوں اور سائنس کے امکانات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اردو شاعری میں ایک بہت ہی مختصر ذخیرہ چھوڑا

ہے، مجنوں مغربی شاعری کے قائل نہ تھے کیونکہ اس میں عقل کا استعمال زیادہ اور روحانیت کم پائی جاتی ہے، مشرقی شاعری میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کا تانا بانا ہے اس کا نشان مغرب میں نہیں ملتا اس سلسلے مجنوں کا کہنا ہے

''وہ شعاع جو زندگی کی روح رواں ہے مغربی شاعری کی گرفت سے بچ کر نکل جاتی ہے اس لئے وہ اپنی استدلالیت کا پھندا ڈال کر اس کو پکڑنا چاہتا ہے یہی شعاع خود بخود اپنے کو مشرقی شاعری کی آغوش میں دے دیتی ہے کیونکہ وہ کبھی اس کو پکڑنے کی کوشش نہیں کرتا جو پکڑنے کی چیز ہی نہیں، مشرقی شاعری کی امتیازی خصوصیت وجدانیت ہے اور مغربی شاعر کی حقیقت'' [۱]

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو شاعری جمالیاتی اور وجدانی عنصر کا نتیجہ ہے،

؎ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

دماغ سے جو بات آتی ہے وہ حقیقت کا جامہ پہنے ہوئے آتی ہے اس لئے وہ اتنی لطیف نہیں ہو سکتی، ان دونوں امتیازی فرق کو مجنوں نے اپنی شاعری میں اجاگر کیا ہے،

سنا ہے تو بڑا خوددار و کم آمیز ہے ساقی
مگر رندوں کو کیا پیمانہ جب لبریز ہے ساقی
نہ واعظ سے ہے ضد ایسی نہ ہے تیرا لحاظ ایسا
طبیعت ہی کچھ اتنی سخت بد پرہیز ہے ساقی

ایک جگہ لکھتے ہیں،

میری ضد میں چمن کو بجلیوں نے خاک کر ڈالا
کہاں سے کنج میں پھولوں کی طرح آشیاں رکھی

---

[۱] (مجنوں گورکھپوری حیات اور ادبی خدمات ڈاکٹر شاہین فردوس، صفحہ ۳۱۴)

مجنوںؔ جب حقیقت کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو برجستہ کہہ اٹھتے ہیں

نشہ اپنا خمار ہے اپنا
پیر میخانہ یار ہے اپنا
عشق ناموس ہے دوعالم کا
عشق پروردگار ہے اپنا
غمِ جاناں کی تھی توفیق کبھی
اب غمِ جاں شعار ہے اپنا
اب غمِ روزگار میں کا میں ہوں
اب غمِ روزگار ہے اپنا

مجنوںؔ نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ وہ اساتذہ کے رنگ میں اشعار نہیں کہہ سکتے مگر آپ کو مجنوںؔ کے یہاں داغؔ، بیدلؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ اور میرؔ کے رنگ میں بھی اشعار ملیں گے، جس کی مثال گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہیں،

مجنوں ایک ذہین کہنہ مشق، باصلاحیت ادیب اور نقاد تھے ادبی نشیب وفراز کا انھیں خوب علم تھا اس لئے چاہے دبستانِ لکھنؤ ہو یا دہلی ان کی زمینوں پر انھیں اشعار کہنے میں نہ تو تامل تھا اور نہ ہی تذبذب تھا، جس کی مثالیں ابتدا میں دی جا چکی ہیں،

دبستانِ لکھنؤ کا اتنا بول بالا تھا کہ غالب کی غزلوں کو وہ درجہ نصیب نہیں ہو پا رہا تھا جو بعد میں انھیں ملا، مجنوںؔ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ انھیں اردو شاعری میں وہ درجہ نصیب نہیں ہوگا جس کے وہ حقدار ہیں ان کے اشعار میں غالبؔ اور بیدلؔ کے ابتدائی دور کی طرح مشکل اضافتوں اور سنگلاخ زمینوں کا پایا جانا بعید از قیاس نہ تھا، گو انھوں نے اپنے اشعار میں ٹیگورؔ کے کلام کی گداختگی، تصوف اور نرمی کا بھرپور فائدہ اٹھایا مگر اس مقام پر بھی وہ غالبؔ، بیدلؔ، نظیریؔ وغیرہ کو نہ بھول سکے، حسب ذیل اشعار قابل توجہ ہیں۔

خطِ ہستی پہ جب دیکھو کشیدہ خط بطلاں کا
یہ عشق لام الف ہے یا نظامِ کاریزداں ہے
یہ سب کون وفساد اک اضطراراس کی مشیت کا
خدا کہتے ہیں جس کو وہ ہے بندہ اپنی قدرت کا

مجنوںؔ اردو شاعری سے بے حد محبت رکھتے تھے اور اس سے ان کا والہانہ لگاؤ بھی تھا لیکن وقت اور نظامِ وقت نے قدم کے رخ موڑ دیئے ان اشعار سے ان کے قلبی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے،

زندگی کی فطرتِ غم غم طبیعتاً تنہا
صبح تک پگھلتی ہے شمع انجمن تنہا

اس ردیف پر بہت کم لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے مگر افسوس کہ پوری غزل دستیاب نہ ہو سکی اس لئے حقیقت کا انکشاف مشکل ہے، ان کا کہنا ہے کہ

''انسان کی زندگی کی قدریں اور ہیئتیں اسی طرح بدلتی ہیں جسطرح آج سائنس کے نت نئے انکشافات وایجادات بدلتے رہتے ہیں'' [1]

غالبؔ نے اردو غزل کے لئے جو نیا میدان فراہم کیا اس کے بعد بھی دنیائے غزل میں وسعت کی گنجائش ہمیشہ بنی رہی اسی لئے میرؔ سے لیکر ابتک غزل کا جائزہ لیا جائے تو نہ معلوم کتنے گنگا اشنان کر چکی ہے اور اس میں نئے نئے تخیلات اور مختلف قسم کے مضامین کی گنجائش بڑھتی گئی جن لوگوں نے اس پر تنقیدیں کی اس کا تعلق بادہ سے زیادہ ہے اور جام سے کم،

مجنوںؔ اشتراک پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی نئی شاہراہوں کے ہمنوا تھے اس لئے ان کی غزلیوں میں اشتراکی نظام کی بو آتی ہے، حسب ذیل اشعار

---

[1] (تاریخ وتخلیق ادب اور زندگی صفحہ ۱۰۴)

اسی روش کی ایک کڑی ہیں،

یہ تاریکی یہ سناٹا یہ اضمحلال تاروں کا
قرینے کہہ رہے ہیں ہونے والی ہے سحر پیدا

وہ پائی نگہ حسنِ آفریں میں نے
بنا دیا ہے ہر ایک چیز کو حسین میں نے
گزر گیا ہوں گمان و یقیں کی منزل سے
سمجھ لئے ہیں سب اسرار کفر و دیں میں نے

مجنوں وہ بے نیاز تو ہم بے نیاز تر
ہم دست کش رہے جو وہ دامن کشاں رہے

مجنوں کے ان اشعار میں ان کے عشق کی داستان چھپی ہوئی ہے اور حسن کی رعنائیوں کی جھلک بھی ہے مگر عشق کی گہرائی کمیاب ہے، مجنوں کی شاعری ان کی ابتدائی زندگی کا پرتو ہے، مجنوں کی جب جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن آئے تو وہ اردو شاعری سے یکسر الگ ہو چکے تھے، یہ بات اور ہے کہ کسی کی فرمائش پر کچھ کہہ دیا جس کی مثال آئندہ صفحات پر ملیں گی،

ہنگامۂ شوق کی نشانی
باقی یہی جان مبتلا ہے

جستجو زندگی کا حاصل ہے
اٹھ گیا جو قدم وہ منزل ہے

اپنی قسمت سے ہمیں رہ گئے محروم عطا
لینے والے تری سرکار سے کیا لے نہ گئے

مرتے دم تک زندگی میں ایک کمی پاتا رہا
اس کو کیا سمجھوں اگر تیرا تمنائی نہ تھا

دل کی وسعت بھی کچھ کم نہیں مجنوںؔ
غم کی کچھ انتہا نہیں نہ سہی

مجنوںؔ گورکھپوری مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے ۱۹۵۸ء میں دائرہ ادب کے سالانہ کل ہند مشاعرے کی تیسری نشست میں حسب ذیل غزل پڑھی،

حسن والفت کی جو داستاں ہے
کچھ حقیقت کچھ اپنا بیاں ہے

ذرہ ذرہ مہ وکہکشاں ہے
اب زمیں روکش آسماں ہے

ناگزیر انقلاب جہاں ہے
ہر نفس گردش آسماں ہے

فصل کیا ہستی ونیستی میں
منزل یک نفس درمیاں ہے

امتیاز وجود وعدم کیا
کارواں درپسِ کارواں ہے

چھوڑ کر چند تنکوں کو بلبل
کچھ قفس ہے نہ کچھ آشیاں ہے

اعتبار وگل وگلستاں کیا
رنگ وبو کی بس ایک داستاں ہے

تم سے چھٹ کر گزرتی ہے کیسی
کیا بتائیں بڑی داستاں ہے
ہے تیری اور کچھ بات مجنوں
یوں تو کہنے کو سارا جہاں ہے

غزل کے ان اشعار سے مجنوں کے فہم وادراک کا پتا چلتا ہے، مجنوں نے نہ تو کسی کی شاگردی اختیار کی اور نہ ہی اپنے کلام پر کسی سے اصلاح لی ان کا کہنا ہے کہ اس سے شعری حقیقت اور نزاکت پر ضرب آتی ہے، مجنوں نے جب گورکھپور کو خیر باد کہا اور علی گڈھ کے شعبۂ اردو کو سرفراز کیا تو وہاں کے مختلف ادیبوں اور فنکاروں کے مکان پر مشاعرے کا اہتمام کیا جانے لگا اسی سلسلے میں ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سابق وائس چانسلر عبدالعلیم کی فرمائش پر پروفیسر آل احمد سرور کے مکان پر ایک نشست ہوئی جس میں غالب کا یہ مصرع طرح ع

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

دیا گیا اکیس اشعار کی غزل لیکر مجنوں بھی پہونچ گئے جس کے دو شعر حسب ذیل ہیں

کس کو سمجھوں آشنا کس کو کہوں نا آشنا
آشنا کے جستجو میں میں ہوں سب کا آشنا

عشق کیا ہے اپنے اپنے ذوق کی تکمیل ہے
کوہ کن خارا تراش وقیس صحرا آشنا

غالب کی اس زمین پر مجنوں کا یہ شعر اس بات کا انکشاف ہے کہ لوگ مجنوں سے آشنا ہیں ہو سکتا ہے کہ مجنوں اس سے نا آشنا ہوں،

دوسرے شعر میں مجنوں نے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ عشق کی تکمیل کے

لئے لوگوں نے مختلف طریقوں کو اپنایا کسی نے تیشہ اٹھایا کوئی صحرا نوردی پر آمادہ ہوا، اگر مجنوںؔ اس راہ پر گامزن رہتے تو ان کی شاعری میں فلسفۂ حیات، سائنسی اور سماجی اثرات، نفسیاتی کیفیات غالب کی طرح ملتیں یہ بات اور ہے کہ وہ اس درجہ تک نہیں پہنچ پاتے جو غالب نے حاصل کیا، مجنوں نے میرؔ کی گدا ختگی اور غم واندوہ کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں چند متفرق اشعار حسب ذیل ہیں،

صیاد و برق و باد سے بلبل کا ہے یہ قول
سو آشیاں نثار اگر گلستاں رہے

طغیان برق و باد سے بلبل کو کیا ہراس
جو خود ہی آشیاں میں آتش بجاں رہے

مگر خاکستر پروانہ میں تاثیر نکلی ہے
سحر سے پیشتر کچھ شمع بھی دل گیر نکلی ہے

یہ گمراہی یہ خود نا آگہی اچھی نہیں اے دل
کسی وادی میں کھو جا اور اپنی جستجو کرلے

نالے وہ کھینچ کہ ابھر آئیں دل کے داغ
ہر گوشۂ قفس سے گلستاں نکالئے

اپنی اپنی پڑی ہے سب کو
دنیا ہی میں حشر ایک بپا ہے

اپنے سے آپ اجنبی ہوں
کیا جائے کہ دل نے کیا کیا ہے

ہاں حسن کے شکوے برحق ہیں ہاں عشق میں کامل کوئی نہیں
بے کار ہیں جلوے ایمن میں جلووں کا مقابل کوئی نہیں

اے راہ نورد راہ طلب اس راہ کی ہے رفتار یہی
اٹھا جو قدم وہ منزل ہے کہنے کی منزل کوئی نہیں

یہ کیسی بے نیازی ناز کس پر رنگ و بو والو
عنادل کے ترانے پھونک ڈالیں گے گلستاں کو

آشنا نا آشنا سے محترز دم ساز ہے
الغرض دل کی عجب افتاد تھی آغاز سے

عندلیبوں کی فغاں ہو یا گلوں کا ہو سکوت
آپ کو پہچانتا ہوں آپ کی آواز سے

ان چیدہ چیدہ اشعار کے علاوہ کلامِ مجنوں میں جن غزلوں کو پیش کیا گیا ہے ان غزلوں پر توجہ کیجئے تو آپ کو تغزل کی رعنائیوں کا لطف ملے گا۔

(غزل)

بے رخی ناروا نہیں نہ سہی مرے شکوے بجا نہیں نہ سہی
دل ہی میرا بلا کا پتلا ہے زلف دام بلا نہ نہ سہی
میں ہی ذوقِ وفا سے عاری ہوں خیر تم بے وفا نہیں نہ سہی
مان لیتا ہوں سب قصور مرا کچھ تمھاری خطا نہیں نہ سہی

آپ کے گیسوؤں کی عمر دراز میرے نالے رسا نہیں نہ سہی
درد کا ماجرا تو سن لیتے درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی

دل کی وسعت بھی کم نہیں مجنوںؔ
غم کی کچھ انتہا نہیں نہ سہی

اس مشکل زمین پر مجنوںؔ نے جو طبع آزمائی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔
دوسری غزل ملاحظہ ہو،

کیا حال اے دل اندوہ گیں ہے
کہ ان سے مل کے بھی جی خوش نہیں ہے

دیا رِ عشق کی کیا سرزمیں ہے
جہاں پستی بلندی کچھ نہیں ہے

جفا ہے یا وفا ہم کچھ نہ سمجھے
تری ہر بات لیکن دل نشیں ہے

یہ بے بالیدگی ہے ننگِ ہستی
جہاں اٹھا تھا درد ابتک وہیں ہے

مجنوںؔ کی صلاحیت اور تغزل کی رعنائیوں سے آپ بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے مجنوںؔ کا کہنا ہے،

"شاعری کا دنیا پر ابتدائے آفرینش سے جو احسان ہے اس کا اعتراف نہ کرنا صریحاً کفر ہے، اگر آج دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو زندگی قطعاً عذاب تھی اور خودکشی ہماری نجات کا ذریعہ، شاعری نے ہمیں اس

قابل بنایا کہ ہم اس عذاب کو راحت سمجھیں اور اپنی دوزخ کو جنت بنالیں، شاعر نے جو سب سے بڑا کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی دنیویت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو فردوس میں تبدیل کر دیا ہے“ [۱]

اب ذرا ان کی رباعیات اور نظموں کی طرف توجہ کی جائے، نظم کے سلسلے میں مجنوںؔ نے بڑی افسردگی سے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ صرف ایک نظم (بلبل) اتفاق سے محفوظ رہ گئی جو درج ہے یہ نظم رسالہ (ایوان) گورکھپور کے شمارہ اپریل ۱۹۳۱ء میں شایع ہوئی تھی جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

نظم

چمن میں لائی ہے پھولوں کی آرزو تجھ کو
ملا کہاں سے یہ احساس رنگ و بو تجھ کو
تری طرح کوئی سرگشتہ جمال نہیں
گلوں میں محو ہے کانٹوں کا کچھ خیال نہیں

خزاں کا خوف ہے نہ باغباں کا ڈر تجھکو
مآل کار کا کچھ بھی نہیں خطر تجھ کو

خوش اعتقاد و خوش آہنگ و خوش نوا بلبل
وہی ادا ہے تری اور وہی صدا بلبل
جگر کے داغ کو پر نور کر دیا کس نے
تجھے اس آگ سے معمور کر دیا کس نے

---

[۱] (زندگی) از مجنوں گورکھپوری مشمولہ نگار ۱۹۲۹ء ص ۷۸)

یہ دل یہ درد یہ سودا کہاں سے لائی ہے
کہاں کہ تو نے یہ طرز فغاں اڑائی ہے

تجھے بہار کا اک مرغ خوش نوا سمجھوں
کہ درمند دلوں کی کوئی صدا سمجھوں

سنو اک آہ کے سامانِ ہست و بود ہے کیا
تو ہی بتا ترا سرمایہ وجود ہے کیا

یہ نظم جان کیٹس کی اوڈ ٹو دی نائٹ انگیل کی روشنی میں لکھی گئی ہے، بلبل نظم کے علاوہ ہماری کاوش اور ادبی حلقوں کی مہربانیوں کی وجہ سے مجنوںؔ کی کچھ نظمیں اور دستیاب ہوگئیں جو کلامِ مجنوں میں درج ہیں نظم (سچ ہے کہ جھوٹ) میں ان کے قلم کی گل پاشیاں دیکھئے،

نظم

مری آمد کا تمھیں رہتا تھا ایسا انتظار
ہر صدا پر دیکھتے تھے سوئے در سچ ہے کہ جھوٹ

جب کبھی اک رات کو قسمت سے ہوتے تھے بہم
رات ہو جاتی تھی باتوں میں بسر سچ ہے کہ جھوٹ

یاد ہیں تم کو بھی وہ آغاز الفت کے مزے
کسقدر انجام سے بھی بے خبر سچ ہے کہ جھوٹ

تم مجھے اپنا بنا کر دوسروں کے ہو رہے
اور مجھے اپنا ہی رکھا عمر بھر سچ ہے کہ جھوٹ

یہ اثر ہوتا تھا میرے درد دل کا یا نہیں
تم دبا لیتے تھے ہاتھوں میں جگر سچ ہے کہ جھوٹ

خیر میں مجنوںؔ سہی دیوانہ ووحشی سہی
لوگ کچھ تم کو بھی کہتے ہیں مگر سچ ہے کہ جھوٹ

نظم (سچ ہے کہ جھوٹ) میں مجنوں کے طپیدن دل اور عشق کے سوز و گداز کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں، عہد و پیمان کی شکستگی دل کے پارہ کی وجہ بنی ہے اس لئے دلی کیفیات کو برملا کہنے پر مجبور ہیں، نمونہ کے لئے (کلام مجنوں) میں دیکھیں،

دوسری نظم (نذرِ عذرا) میں جن کیفیات کا ذکر ہے اس میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے جس کو آپ کلام مجنوں میں دیکھ سکتے ہیں، یہ نظم مجنوںؔ کے جذبات میں اس حد تک بحران لائی کہ وہ تسکینِ قلب کے لئے کہہ اٹھے،

یاد ایام کہ جب عذرا تھی مجھ سے ہمکنار
جب نہ تھی فصل خزاں سے آشنا اپنی بہار

مستیاں تھیں جب مرے ناواقفیت کیف خمار
روز روشن کو نہ تھی آگاہی شبہائے تار

لمعۂ لاہوت وہ آنکھوں سے پنہا ہو گیا
میرا دار العیش یا رب بیت احزاں ہو گیا

عشق کا یہ بحران اور ٹوٹے ہوئے دل کی فغاں یہاں نہیں تھمتی ہے اور مجنوںؔ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کیا ہوا ساز طرب وہ کل کی صحبت کیا ہوئی
حور میری کیا ہوئی وہ میری جنت کیا ہوئی

حوصلے وہ کیوں نہیں وہ دل کی ہمت کیا ہوئی
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اگلی مسرت کیا ہوئی

ہجر کی بے تابیاں ہیں کس قدر ہنگامہ خیز
آ جلا کر خاک کر دے اے ادائے شعلہ ریز

جذباتِ مجنوں میں اس حد تک بحران آیا کہ وہ تسکین قلب کے لئے کہہ اٹھے

کیجئے ذکر دل ناشاد کیا
ہائے اس کھوئے ہوئے کی یاد کیا

بجلیوں نے پھونک ڈالا آشیاں
جستجو میں ہے مرا صیاد کیا

ان نظموں سے مجنوں کی صلاحیت کا انکشاف ہوتا ہے اور انھوں نے اس صنف کا پاس رکھا ہے جو نظم کے ضروری اجزاء ہیں حسب ذیل نظم میں خود مجنوں اپنے دل سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں، جو اس قدر بے بسی کا شکار ہے۔

وہ حسرتیں نہ رہیں وہ جوش آرزو نہ رہا
چبھے وہ خار کہ سودائے رنگ و بو نہ رہا

جو آس ٹوٹ گئی ہے تو بے قرار نہیں
بلاکشانِ محبت کا یہ شعار نہیں

ہوئی ہیں عشق کی کیفیتیں عذاب مجھے
امید وار بنا کر کیا خراب مجھے

تجھے تو حسن سے یوں ہمکنار ہونا تھا
اک آبگینۂ تمثال دار ہونا تھا

نظم دل سے خطاب میں یاس وحرماں، کرب وضطراب شکوہ گلہ کا آئینہ دار ہے اگر پوری نظم پر نظر ڈالی جائے تو مجنوں کی بے بسی، یاس وغم کا مکمل احساس ہوتا ہے، اس نظم میں آگے لکھتے ہیں۔

خیالِ یار کا اب احترام کرنے دے
تڑپ تڑپ کے مجھے صبح وشام کرنے دے

حریم ناز میں نذریں قبول ہوجائیں
وہ نالے کھینچ کہ سب زخم پھول ہوجائیں

مکمل نظم ان کے دل کا آئینہ ہے جو ان کی ذہنی الجھنوں کا منظر عام پر لاتی ہے، مجنوں کی جو نظمیں دستیاب ہیں وہ صنف نظم کے ہر ضروری لوازمات کو پورا کرتی ہیں مگر ان کی غزلوں میں جو رنگ وبو ہے نظموں میں وہ آب وتاب نہیں ہے، نظم میں جوش ملیح آبادی، یا احسان بن دانش اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ہوسکتا ہے کہ مجنوں اگر اردو شاعری میں بندھ کر رہ جاتے تو اس مقام سے آگے بڑھ جاتے جو بہت سے نظم لکھنے والے شعراء کو حاصل ہوا ہے پھر بھی اس تھوڑے سے عرصے میں انھوں نے جو

بھی کہا خوب کہا،

”نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہوگی جس میں بالیدگی ہو، ابتدا اور وسط اور انتہا ہو اور ہر چیز اس طرح کل میں ہوجائے کہ کہیں سے جھول نہ معلوم ہو، خود غزل کے ایک شعر میں ایک مصرع دوسرے مصرع سے مربوط نہ ہو تو اچھا شعر نہیں کہلا سکتا، نظم کے پہلے مصرع سے ہمیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ جیسے ایک لپٹی ہوئی چیز کو کھولا جارہا ہے، بغیر بالیدگی اور ارتقاء کے نظم نہیں، پہلے شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جائے تو پہلے کی یاد تو رہ جائے لیکن دوسرا ذہن کو آگے بڑھائے“ [۱]

مجنوں نے غزل اور نظم کے علاوہ رباعیات بھی کہی ہیں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ تو بہت مشکل ہے کیونکہ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ جس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بے انصافی ہوگی، رباعیات کا نمونہ ملاحظہ ہو،

کیا دے نہ گئی تیری محبت مجھ کو
کونین کی مل گئی دولت مجھ کو
دنیا کا ملال ہے نہ عقبیٰ کا خیال
اب دونوں جہاں سے ہے فراغت مجھ کو

☆

دنیا کو جائے کامرانی سمجھے
ایک کھیل تھا جس کو زندگانی سمجھے
اللہ رے فریب سیمائے ہستی
ہر سانس کو اپنی جاودانی سمجھے

☆

کیا پوچھتے ہو کہ زندگانی کیا ہے
ہم کیا کہیں تجھ سے یہ کہانی کیا ہے
پڑجائے جو سر پر جھیل جانا مجنوں
غم کہتے ہیں کس کو شادمانی کیا ہے

☆

نذرِ غمِ عشق فکر دنیا کرنا
وہ پہلے پہل تیری تمنا کرنا

---

۱ (نگار سالنامہ میں مجنوں کے تاثرات، پاکستان جولائی اگست ۱۹۶۵ء ص ۱۴۷)

ہیں یاد وہ ابتدائے الفت کی مزے　　پہروں چپ چاپ تجھے دیکھا کرنا

☆

ہر سانس عدم کا ہے فسانہ مجنوںؔ　　جینے مرنے کا ہے بہانہ مجنوںؔ
ایک نقش پر آب ہے نمودِ ہستی　　ایک شعبدہ باز ہے زمانہ مجنوںؔ

☆

وہ بزم نشاط ے پرستی کیا تھی　　غافل وہ رات بھر کی مستی کیا تھی
پروانوں کی خاک اڑی بجھی شمع سحر　　معلوم ہوا بساط ہستی کیا تھی

ان ساری رباعیات میں آسیؔ غازیپوری کے کلام کی جھلک ہے نمونہ کے لئے کلام مجنوں دیکھئے، مگر ان رباعیات اور نظموں میں غزلیات کی خوشبو پیوست ہے، مجنوں عشق ومحبت، رنج وغم آلام روزگار کی کلفتوں سے اس قدر دبے ہوئے تھے جس کی جھلک غزل ہو یا نظم یا رباعیات سب میں برمحل نظر آتی ہے،

مجنوں نے اردو شاعری میں بہت گہرے اور پایہ دار نقوش نہیں چھوڑے ہیں مگر ان کی لیاقت اور ذہانت نے ان کو اس میدان میں بہتوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اس کی مثال بالکل اسی طرح سے ہے جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مقابلے میں مجنوں کے خطوط، یہی کیا کم ہے کہ اردو شاعری میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ قابل تحسین ہے، مجنوں کا کہنا ہے کہ میں نے شاعری سے کنارہ کشی اس لئے اختیار کی کہ بقولِ غالب　ع

؎ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیان کے لئے

۱۹۳۱ء تک پہنچتے پہنچتے وہ اردو شاعری سے الگ ہو گئے اور اردو نثر کو اپنے خیالات کے اظہار کے ذریعہ بنایا،

مجنوں شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا جاچکا ہے حسب ذیل غزلیں اور نظمیں ان کے ذوقِ سلیم کا پتا دیتی ہیں، ملاحظہ ہو۔

غزل

رہ جائیں فلک والے شورش سے نہ بیگانہ
ناہید کو تڑپا دے اے نعرہ مستانہ
کچھ اور بھی جلوے ہیں کچھ اور بلاوے ہیں
لے تیرا خدا حافظ اے جلوۂ جانانہ
میخانہ کی حرمت کا کچھ پاس بھی ہے لازم
لغزش میں قرینے سے اے لغزش مستانہ
آزادی کی دھومیں ہیں شہر میں ترقی کے
ہر گام ہے پسپائی ہر وضع غلامانہ
اے عقل و خرد والے مجنوں کا گلہ کیسا
دیوانے کو کیا کہئے دیوانہ ہے دیوانہ [۱]

ذوق جنوں کے واسطے ساماں نکالئے
یعنی ہر ہنگی میں گریباں نکالئے
نالے وہ کھینچ کے ابھر آئیں دل کے داغ
ہو گوشۂ قفس سے گلستاں نکالئے
اب حسرتوں کے سوگ میں دل خون ہی سہی
کچھ تو علاج گردش دوراں نکالئے
ملتی ہیں کوئی شوق شہادت کی کاوشیں
اک رگ سے آپ لاکھ رگ جاں نکالئے
دفتر پارینہ ساز منتشر ہونے کو ہے [۲]

---

۱ (نقوش) لاہور، غزل نمبر، ایڈیٹر محمد طفیل، فروری ۱۹۵۶ء ۲ (نگار) لکھنؤ مئی ۱۹۲۶ء ایڈیٹر نیاز فتحپوری

یہ نظام زندگی زیروزبر ہونے کو ہے

چند نے جس کو بنا رکھا تھا اپنا خاص راز

اس حقیقت سے زمانہ باخبر ہونے کو ہے

جس نے دے رکھا ہے یوسف کو محبت کا فریب

اب وہ افسونِ زلیخا بے اثر ہونے کو ہے

کھو چکا ہے ساتھ حسن حیلہ راز وفتنہ گر

عشق کی آزاد فطرت معتبر ہونے کو ہے

سر پر جوش وشرر تھا فتنہ وآشوب تھا

آج کا میں ختم وہ دور قمر ہونے کو ہے

رات بے دم چاندنی پھیکی، ستارے مضمحل

کچھ افق پر تھر تھراہٹ ہے سحر ہونے کو ہے

قطرہ قطرہ ہوگا دریا ذرہ ذرہ آفتاب

از سرِ نو اہتمام خشک وتر ہونے کو ہے

ہر کس وناکس بقدر ظرف ہوگا کامیاب

روزگارِ نامرادی مختصر ہونے کو ہے

یہ بشارت دے گئی ہے باغ کو بادِ بہار

ہر نہالِ بے ثمر اب بارور ہونے کو ہے

اے سرِ شوریدہ بس تھوڑی سی شورش اور بھی

روزنِ دیوارِ زنداں بڑھ کے در ہونے کو ہے

وہ سوادِ دشتِ وحشت ہے نظر کے سامنے

اب جنوں آسودہ ہر شوریدہ سر ہونے کو ہے

کن رہا ہوں آنے والے وقت کے قدموں کی چاپ

گردشِ دوراں بہ اندازِ دگر ہونے کو ہے
جو ہونا چاہئے تھا آج تک ہوتا رہا
اب جو ہونا چاہئے وہ بے خطر ہونے کو ہے
تا کجا ہشتاد سالہ رہبروں کی پیروی
کارواں رفتہ گردِ رہگذر ہونے کو ہے
اک نہ اک دن دہر میں ہو کر رہے گا انقلاب
آج ہی پھر کیوں نہ ہو جائے اگر ہونے کو ہے

(فنکار) ایڈیٹر پرکاش پنڈت ص ۱۱۹

(دل سے خطاب)

زمانہ (کانپور، ستمبر ۱۹۲۶ء، صفحہ نمبر ۱۸۱

وفورِ شوق تھا یہ انتہائے بے ادبی ۔۔۔ بزعم عشق تمنائے مدعا طلبی
یہ شعور اے دل ناکام جستجو کیا ہے ۔۔۔ بتا بتا مجھے یہ حشر آرزو کیا تھا
اسیر وا آگہہ نقش ہائے باطل تھا ۔۔۔ بس اسی قدر تیری بے تابیوں کا حاصل تھا
وہ حسرتیں نہ رہی جوش آرزو نہ رہا ۔۔۔ چبھے وہ خار کہ سودائے رنگ و بو نہ رہا
جو آس ٹوٹ گئی ہے تو بیقرار نہیں ۔۔۔ بلا کشان محبت کا یہ شعار نہیں
ہوئی ہیں عشق کیفیتیں عذاب مجھے ۔۔۔ امیدوار بنا کر کیا خراب مجھے
تجھے تو حسن سے یوں ہمکنار ہونا تھا ۔۔۔ ایک آبگینہ تمثال دار ہونا تھا
تو آپ اپنی حقیقت کا راز داں ہو جا ۔۔۔ لہو کی بوند سے ایک بحر بیکراں ہو جا
خیال یار کا اب احترام کرنے دے ۔۔۔ تڑپ تڑپ کے مجھے صبح و شام کرنے دے
حریم ناز میں نذریں قبول ہو جائیں ۔۔۔ وہ نالے کھینچ کے سب زخم پھول ہو جائیں
وصال و ہجر کا اب امتیاز رہنے دے ۔۔۔ حضور حسن مجھے سرفراز رہنے دے
میری حیات میری بے قراریوں میں ہے ۔۔۔ میری نجات انھیں اشک باریوں میں ہے
فضول شکر شکایت سے پاک رہنا ہے ۔۔۔ مجھے جنوں ہے تو دامن کو چاک رہنا ہے
تمام عمر کا سرمایہ ہے جگر کی چاکی ۔۔۔ میرے وجود پہ چھائی رہے المناکی
متاع زیست ہے سوز و گداز میرے لئے ۔۔۔ بہت ہے یعنی محبت کا راز میرے لئے

(جذبات حسن)

ایک برق حسن شب کو تجلی فروش تھی
جذبات مضطرب کی مرے پردہ پوش تھی

تھا اقتضائے دل لب اظہار وا کروں
تاثیر رعب حسن کو لیکن میں کیا کرو

وہ گردش نگاہ عجب کام کر گئی
سو بار آکے ہونٹوں میں آواز مر گئی

جب مسکر کے اس نے کیا مجھ سے یہ سوال
کس نے کیا ہے تیری تمنا کو پائے مال

کس کشمکش میں جان ہے کیا اضطراب ہے
کس آرزو کے کھیل میں ناداں خراب ہے

میں کر سکا نہ ضبط تو آنسو ٹپک پڑے
پیمانہ ہائے بادۂ الفت چھلک پڑے

بس ترجمانِ راز نہاں ایک آہ تھی
بے تابیوں کی شرح میری ایک نگاہ تھی

اس پیکر جمال نے پھر یوں کیا خطاب
اے مہوش میرے سوالوں کا دے جواب

کیا حسن ظاہری کا پجاری ہے سچ بتا
کیا میری شکل ہی تجھے پیاری ہے سچ بتا

کیا میرے وصل ہی کے لئے ناشکیب ہے
ایسی ہی ہے اگر تو ہلاک وفریب ہے

حسنِ نظر فریب فریب شباب ہے
یہ میری آب وتاب تو موج سراب ہے

نفسانیت کا تیری یہ سب مکر وکید ہے
ہاں دام گاہِ حرص وہوا کا تو صید ہے

مجھ سے تو بڑھ کے فصل بہاری ہے دل ربا
وہ کوئلوں کی کوک وہ جھونکا نسیم کا

مجھ سے زیادہ حسن تو ہے آفتاب میں
تنویر یہ کہاں میرے رنگ وشباب میں

بہتر ہے جی لگائے جو فصل بہار سے
ہر سال یہ دکھائے گی منظر نئے نئے

حقدار تیرے دل کی ہے خورشید کی چمک
ممکن نہیں کہ اس میں تغیر ہو حشر تک

سودا اگر میرا ہے تو سن گوش وہوش سے
اب خیال گیسوئے کاکل کا چھوڑ دے

اس واسطے کہ جذبۂ الفت نہ ہو فنا
اور میرے حسن کو بھی ملے دائمی بقا

نافہم خدوخیال پہ مائل کبھی نہ ہو
ایسے اثر کو ڈھونڈھ جو زائل کبھی نہ ہو

زمانہ (کانپور) فروری ۱۹۲۳ء ص ۱۱۹

(نذرِ عذرا)

یاد ایام کے جب عذرا تھی مجھ سے ہمکنار
جب نہ تھی فصل خزاں سے آشنا اپنی بہار
مستیاں تھیں جب میری ناواقفیت کیف خمار
روز روشن کو نہ تھی آگاہی شبہائے تار

لمعۂ لاہوت وہ آنکھوں سے پنہاں ہو گیا
میرا دارالعیش یارب بیت احزاں ہو گیا

اے کہ رنگینی سے تیری ہر ادا معمور ہے
پیکرِ انسان ہو کر تو سراپا نور ہے
تیری ہر موج تبسم جلوہ گاہ طور ہے
یہ تو بتلا کون سے پردے میں اب مستور ہے

روح پرور ہو کے طرز جانستانی کس لئے؟
اپنے موسیٰ پر یہ جورِ لن ترانی کس لئے؟

کیا ہوا ساز طرب وہ کل کی صحبت کیا ہوئی؟
حور میری کیا ہوئی وہ میری جنت کیا ہوئی؟
حوصلے وہ کیوں نہیں وہ دل کی ہمت کیا ہوئی؟
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں اگلی مسرت کیا ہوئی؟

ہجر کی بے تابیاں ہیں کس قدر ہنگامہ خیز
آ جلا کر خاک کر دے اے ادائے شعلہ ریز

ہائے مجنوں فصل گل میں وقف زنداں ہو گیا
خوگر وحشت خرامی پابداماں ہو گیا
ہاں کبھی یوں دشت پیمائی کا ساماں ہو گیا
بند کیں آنکھیں تو پیدا ایک بیاباں ہو گیا

آفریں ذوق جنوں ہاں تجھ پہ صد ہا آفریں
قیدِ میں بھی جذب یکسوئی ہے صحرا آفریں

ہر نگاہ یاس میرے سوز کی غماز ہے
اشک جو آنکھوں سے ٹپکا ترجمان راز ہے
نالۂ بیتاب ہے گو صدائے ساز ہے
واہ کیا دلدوز ٹوٹے دل کی بھی آواز ہے

گر ہمی خواہی بیابی سوز ناک آہنگ را
مضطرب امشب ساز کن با نالۂ من چنگ را

مجنوں گورکھپوری، نگار (لکھنؤ) ایڈیٹر نیاز فتح پوری فروری ۱۹۲۳ء

(جذبات مجنوں)

خودی سے دل مرا گھبرا رہا ہے　　کوئی مجھ میں سمایا جا رہا ہے
حنائی ہاتھوں سے آنچل سنبھالے　　یہ شرماتا ہوا کون آ رہا ہے
نہیں درکار ارمانوں کا شورش　　دل گم گشتہ کیوں یاد آ رہا ہے
کیجئے ذکر دل ناشاد کیا　　ہائے اس کھوئے ہوئے کی یاد کیا
بجلیوں نے پھونک ڈالا آشیاں　　جستجو میں ہے میرا صیاد کیا

دل پیکر ظلمت ترے جذبات کی منزل نہیں　　تو خلد کی تنویر ہے جا میں تیرے قابل نہیں
اے عندلیب خوش گلو محو فریب رنگ و بو　　اے گرانِ آرزو پھولوں سے کچھ حاصل نہیں

نفس کو دھوکا نہ دیجئے کیا کیا تقدیر نے　　آپ کو رسوا کیا جولانیٔ تدبیر نے
ہائے پھر افسانۂ عہد بیاباں چھیڑ کر　　کردیا وارفتہ مجھکو نالۂ زنجیر نے
یاد آتی ہے شب عصیاں تو شرماتا ہوں اب　　لذت تقصیر کھودی خجلت تقصیر نے
مرتے دم تک دیکھتا ہی رہ گیا محلوں کا خواب　　خاک میں مجھ کو ملایا حسرت تعمیر نے

حسن کے جلووں سے شرمندہ نہ ہوں　　درد میں نے اس لئے پیدا کیا
حسن خوابیدہ کا عالم کچھ نہ پوچھ　　صبح تک میں ان کا منھ دیکھا کیا

زمانہ (کانپور) فروری ۱۹۲۵ء ص ۵۳)

(۵)

مجنوں کی صحافت نگاری

صحافت نگاری

مجنوں گورکھپوری کی حیثیت اس سیماب کی سی ہے جو کسی ایک مقام پر ٹھہر نہیں سکا ابتداء تو شاعری سے ضرور ہوئی مگر یہ خلش دل میں تھی کہ اردو ادب کے دوسرے صنف پر بھی طبع آزمائی کی جائے اس لئے دھیرے دھیرے شاعری کی لو مدھم پڑتی گئی ان کے دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت اور امنگوں کا جوش تھا، جستجو اور طلب کی خواہش تھی شاعری کے میدان سے نکلنے کے بعد اردو ادب کو کس رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے وہ ان کے آبلہ پا ہی بتا سکتے تھے، مولوی سبحان اللہ صاحب (رئیس گورکھپور) اور شاہد علی فانی گوررکھپوری کے وہاں جو کتب خانہ تھا مجنوں صبح سویرے ہی ان کے دولت کدہ پر پہنچ کر کتب بینی میں مشغول ہو جاتے تمام دن اردو کے مختلف مسائل پر محققین سے مباحثہ کیا کرتے، ان کے جذبہ کے تحت یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

کب صبح ہوئی کب شام ہوئی، کب رات ہوئی
ہم عشق میں ایسا محو ہوئے اوقات شبانہ بھول گئے

یہ ساری کشمکش اس بات پر منحصر تھی کہ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس سے اردو کی سرپرستی ہو سکے، مالی تنگی اور حالات نے انھیں مجبور کیا کہ وقت کا انتظار کریں، ان کے والد بزرگوار فاروق دیوانہ گورکھپور کے شاہی امام باڑہ اور اسٹیٹ کے منیجر تھے اس کے متولی اور سرپرست شاہ جواد علی شاہ تھے ان کے ادبی ذوق نے مجنوں کے (ایوان اشاعت) کے خیال کی تائید کی اور شاہی امام باڑہ کے ایک حصہ میں اسکی بنا پڑ گئی جس میں سید ضامن علی برابر کے شریک تھے امتیاز احمد اشرفی نے مجنوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی مجنوں ان کو اپنا ایک بازو سمجھتے تھے مگر سامریت کی ظالمانہ کارکردگی نے ان کو اس قابل نہ رکھا کہ (ایوان اشاعت) کی ترقی کو دیکھ سکیں۔

ایوان اشاعت، کے کچھ اصول وضابطے بنائے گئے جیسے دستاویز غیر مطبوعہ

مواد، اور ایسی کتابیں جن کا تعلق طلباء اور خواتین سے ہو اس کے شائع کرنے کا نظم تھا، اس سلسلے میں اس بات کو بھی عیاں کر دیا گیا کہ اس ادارہ کی رکنیت کیسے قائم ہو سکتی ہے، ایوان اشاعت، ایوان نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا تھا جس میں زیادہ تر مضامین مجنوں کے ہی ہوتے تھے رسالہ ایوان کی ترقی فلاح و بہبودی کا سارا بار مجنوں پر ہی تھا اس تمام باتوں سے مجنوں کی صحافت سے دلچسپی اور اس میدان میں ان کی کارکردگی کا پتا چلتا ہے، مجنوں کو اس بات کا غم تھا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور کوششوں کے باوجود رسالہ کو وہ مقام نہ دلا سکے جس کی تمنا تھی اس رسالہ کے نکالنے میں انھوں نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا، مربیوں ادیبوں اور شعراء سے معیاری مضامین، نظمیں، اور غزلیں بھیجنے کی گذارش کرتے رہے اس رسالے کی ایک خوبی یہ تھی کہ مجنوں مختلف لوگوں کے مضامین شعراء کی غزل اور نظم کے سلسلے میں اپنے تاثرات کے ساتھ ساتھ تمہید بھی پیش کرتے تھے، رسالہ، ایوان، میں گورکھپور کے مشہور وکیل منشی گورکھ پرشاد کی شاعری کے سلسلے میں مجنوں کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں

> ''آپ حالؔی کا تتبع کرتے تھے لیکن آپ نے جو کچھ لکھا اس میں ایک ندرت، ایک کیفیت اور ایک ولولہ پایا جاتا ہے'' [۱]

شرف الدین صاحب کے بحرِ عشق کے بارے میں ان کا خیال ہے،

> ''اس افسانے کا مواد جہاں سے بھی حاصل ہو وہ حوالہ کا محتاج ہے مگر جہاں تک معنویت کا سوال ہے یہ افسانہ اختصار اور انداز بیان کی دل کشی کے اعتبار سے ایک ادبی حیثیت رکھتا ہے'' [۲]

اسی طرح کے بے شمار افسانوں مضامین اور اشعار کے بارے میں تبصرہ رسالے میں جا بجا ملتے ہیں ان باتوں سے مجنوں کی صحافت پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے مگر اس میدان میں انھیں کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں مل

---

[۱] (شمارہ ۲ر فروری ۱۹۳۱ء ص ۲) [۲] (اداریہ ایوان جلد ارشارہ ۳ مارچ ۱۹۳۱ء ص ۳)

سکا البتہ ان کی توجہ نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی طرف برابر بنی رہی،

(ایوان) اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا اس وجہ سے ارادہ ہوا کہ ایوان کا سالنامہ نکالا جائے اور اس کو بہترین نظموں، غزلوں اور مضامین سے مرصع کیا جائے مگر ان کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا جیسے جیسے وقت گزرتا گیا رسالہ کی خریداری کم ہوتی چلی گئی جس سے ادارہ کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا، مگر اس حادثہ سے مجنوں کے جوش وولولہ میں کمی نہیں آئی وہ ایوان کے بند کرنے کے حق میں نہ تھے، ۱۹۳۴ء تک پہنچتے پہنچتے خرابی صحت اور لاحاصل محنت نے رسالہ کو بند کردینے پر مجبور کردیا وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئے، رسالہ نے تقریباً دوسال کی زندگی پائی، تجربہ کی بنا پر یہ طے کیا کہ یہ ادارہ سال میں ایک یا دو علمی کتابیں شائع کرنے کا بار اٹھائے گا جس میں ایسے مضامین ہوں جو قارئین کو متاثر کرسکیں، موصوف خریداروں کی تعداد سے تو مطمئن تھے مگر ادارہ کے نظم ونسق سے خوش نہ تھے، مجنوں کا یہ خیال تھا کہ رسالہ میں اگر بزم احباب کا کالم مستقل مزاجی سے نکلتا رہے تو اس رسالہ کا معیار بڑھے گا اور قارئین کے لئے مفید ثابت ہوگا مگر ایسا نہ ہوسکا، اس میں شک نہیں کہ مجنوں صحافت کے میدان میں پابہ جولاں رہے ان کی یہ پابہ جولانی ابوالکلام آزاد کے صحافت کے دروزاے تک نہیں پہنچ سکی اس مجاہد نے صحافت کی وہ نظیر پیش کی ہے جس سے بڑے بڑے اہل قلم انگشت بدنداں رہ گئے،

مجنوں نے (استحالات عشق) کا جو ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا ہے اس کو ادیبوں اور نقادوں نے بہت سراہا ہے، موصوف کا مضمون (خواب اور تعبیر خواب) ان کی دل کش تحریر کا نمونہ ہے خواب الگ چیز ہے تعبیر سے اس کی مناسبت نہیں، خواب پر جو تعبیریں بنائی جاتی ہیں وہ بڑی کمزور وناتواں ہوتی ہیں، خواب کی تعبیر تو قدرت کی ایک نوازش ہے جس کو رب کائنات نے یوسف علیہ السلام کو عطا کی تھی، قید خانہ میں جن دو قیدیوں نے اپنے خواب کا ذکر کیا اس کی تشریح جو یوسف علیہ السلام

نے کی وہ کسی علم نجوم کی پہنچ سے باہر تھی، مجنوں کا یہ مضمون خواب کے پرانے اور نئے خیالات کا تجزیہ ہے اردو زبان میں اس طرح کا فقدان تھا، مجنوں کی ذات نے اردو ادب میں ایسے مضامین کی کمی کو پورا کرنے کی کاوش کی،

ایوان اشاعت سے جب رسالہ (ایوان) کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور سال میں کچھ کتابوں کے چھپنے کا عہد کیا گیا تو مجنوں کی درجنوں کتابیں ایوان سے شائع ہوئی جیسے شوپنہار، زہر عشق، خواب وخیال، کلیات میرؔ، وغیرہ جب شوپنہار کا تفصیلی جائزہ کتابی شکل میں منظر عام پر آیا تو اس سے مجنوں کو کافی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کچھ اخبارات نے تو مجنوں کی اس نوشت کو سراہا اور کچھ نے ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا، مجنوں کو ایسے خطوط بھی ملے جس نے شوپنہار کی کھلی اسلامی دشمنی کو بیان کیا اور جواب طلب کیا کہ ایسا کرنے میں کیا فائدہ تھا اس سلسلے میں مجنوں لکھتے ہیں،

''مسلمانوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچا کہ ان کو ایک دشمن اسلام کے خیالات معلوم ہو گئے'' [1]

مجنوں کی ادبی تحریریں جو صحافتی نقطہ نظر سے قارئین تک پہنچی اس سلسلے میں علامہ اقبالؔ کا یہ کہنا قابل قدر ہے۔

''آج مجھے معلوم ہوا کہ اردو زبان بھی اس قابل ہے کہ اس میں فلسفہ کو ادب بنا کر پیش کیا جا سکے''

مثنوی زہر عشق کے سلسلے میں مجنوںؔ کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی صاف گوئی کا نتیجہ ہے اس سلسلے میں نقادوں نے بہت سے انگریزی مصنفوں اور اس دور میں لکھنؤ میں جو مثنوی لکھنے کا رواج چل پڑا تھا اس سے مجنوں کے خیالات کو توانائی ملی، نیاز فتحپوری نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جو درجہ زہر عشق کو حاصل ہوا وہ کسی اور مثنوی کو حاصل نہیں ہوا اس سلسلے میں میرؔ حسن، اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کو فراموش نہیں کیا

---

[1] (خود نوشت نمبر ۴ر ارمغان مجنوں جلد، اول ص ۹۹)

جاسکتا، درسیات کے سلسلے میں جو کتابیں ایوان اشاعت سے شائع ہوئیں اس میں ہندوستان کی بہادر عورتوں کا ذکر ہے، مجنوں کی کتاب کے علاوہ دوسرے مصنفوں کی کتابیں بھی اس ادارہ سے شائع ہوئی ان پر مجنوں کے تبصرات نے کتاب کی چاشنی کو بڑھادیا، خدائے سخن میر تقی میر کی کلیات کی زبوں حالی کو دیکھ کر مجنوں بہت رنجیدہ رہتے تھے ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی جب ان کو شاہ جواد علی شاہ والی شاہی امام باڑہ کے تعاون سے میر کا نیا ایڈیشن شائع کرنے کا موقع ملا اور اس نئے ایڈیشن کا نام انھوں نے نسخۂ جوادیہ رکھا، نسخۂ جوادیہ کو آٹھ جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا چونکہ ایوان اشاعت ۱۹۳۲ء میں مکمل طور سے بند ہوگیا اور مجنوں نے میر کی کلیات کے مکمل ہونے کے سلسلے میں اپنی تحریروں میں کہیں ذکر نہیں کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نسخۂ جوادیہ مکمل طور سے شائع نہ ہوسکا، ایوان اشاعت کے دوسرے دور میں جو سب سے پہلی کتاب شائع ہوئی وہ (سمن پوش) تھی جس میں روحانیت کا درس دیا گیا ہے اس کے بعد مجنوں کی دوسری کتاب (آغاز ہستی) شائع ہوئی جس کو انھوں نے رگھوپتی سہائے کے نام سے منسوب کردیا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ فراق نے ہی برناڈ شاہ کی تمثیل کا ترجمہ کرنے کی ہدایت کی تھی، جمالیات پر مجنوں نے ایک نایاب کتاب لکھی جس کا نام (تاریخ جمالیات) ہے اس میں مشرق ومغرب کے مفکروں کے خیالات کا تانا بانا ہے، اس کتاب کو جب دوبارہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تو اس میں دو مضامین کا اضافہ ملتا ہے، باوجود مجنوں کے کوششوں اور قربانیوں کے ایوان اشاعت نے بڑی مختصر زندگی پائی اور اس ایوان میں جتنی کتابیں شائع ہوئیں وہ ایک مختصر فہرست کی حامل ہیں، مجنوں نے اپنے زندگی کے ابتدائی دور میں جب وہ نیاز کے دوستی کے اسیر تھے قیام لکھنؤ میں دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ ایک ایسا رسالہ نکالا جائے جس کا تعلق روحانیت سے ہو اس رسالہ کے مدیر تو نیاز تھے اور مضامین کی ذمہ داری مجنوں کے سر پر تھی، رسالہ کا نام (جن) رکھا گیا، مگر یہ پرچہ

چار پانچ شماروں کے بعد بند ہو گیا بقول مجنوں کہ اس پرچے نے اپنی اشاعت کا دوسرا سال نہیں دیکھا مجنوں نے اس پرچے میں ارواح کی جو ہیئت پیش کی وہ بہت دل چسپ اور معلوماتی ہے،

اردو صحافت کو جس عظیم شخصیت نے اوج ثریا تک پہنچانے کا عزم کیا تھا وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے انھوں نے اس میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس کی مثال مشکل ہے انھوں نے صحافت کے میدان کو وسیع تر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی بعد ازاں اس میدان میں بہت سے سورماں پیدا ہوئے جن کی کارکردگی قابل تحسین ہے اسی کارواں میں ایک مجاہد بھی تھا جسے ہم احمد صدیق مجنوںؔ کہتے ہیں انھوں نے صحافت کے میدان میں نئی تخلیقات کو جنم دیا اور اس بات کے کوشاں رہے کہ یہ منزل ہمیشہ روشن رہے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خواب دیکھا تھا اس کو پائدار بنانے کا عزم زندہ رہے، کامیابی نے ان کے قدم چومے اور حالات نے ان کی ہمت افزائی کی آج ان کے صحافت کے درخشندہ نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں مگر وہ نہیں ہیں۔

(۶)

مجنوں کی افسانہ نگاری

مجنوں نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے،

''میرا مزاج نثر سے زیادہ مانوس تھا ایسی نثر سے جو شاعری کی تمام پاکیزگیاں اور نزاکتیں اپنے اندر رکھتی ہو، مگر ساتھ ہی ساتھ اس رسائی اور پنہائی کی بھی مالک ہو جو ساری کائنات اور ماورات کائنات کے حقائق کا احاطہ کر سکے''

مجنوں کی افسانہ نویسی ان کی نثر نگاری کی آئینہ دار ہے مجنوں کے افسانہ نگاری کی بنا ۱۴/۱۰/اکتوبر ۱۹۲۶ء میں جب ان کی شادی افراق احمد کی صاحبزادی حمیرہ جو ذکی صاحب ایڈوکیٹ کی بہن تھیں سے ہوئی۔

مجنوں کی فلسفیانہ زندگی اور دور بینی کو دیکھتے ہوئے اہلیہ ذکی صاحب مرحوم نے انھیں نیاز فتحپوری کے افسانہ (شہاب کی سرگذشت) کے مقابلے کی کہانی لکھنے کے لئے اُکسایا، (زیدی کا حشر) کیا ہوا یہ افسانہ مختلف رسالوں میں چھپا اور یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کو ایسی ہوا ملی کہ جلد ہی ان کے افسانوں کے چرچے ہر طرف ہونے لگے ان کا سب سے پہلا افسانہ (گہنا) جو فراقؔ کی اصرار پر لکھا گیا کافی مقبول ہوا اور اس طرح سے مختلف ادبا اور امتیازی شعرا نے مجنوں کی افسانوی صلاحیت کو اجاگر کیا ان کے افسانہ نگاری کا دور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک رہا بقول مجنوں

''میرے افسانے رومانی مدرسے کی چیزیں ہیں اور ان کا تعلق نفسیاتی انفرادیت ہے میں نے اب تک جتنے افسانہ لکھے ہیں سب کا تعلق بہ ظاہر محبت سے ہے لیکن اگر غور سے پڑھا جائے تو رومانیت اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ ان میں فکر و تامل کا ایک میلان ضرور ملے گا جو غالب اور حاوی ہوگا'' [1]

مجنوں نے دوسری جگہ افسانے کے مختلف پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے،

---

[1] (سمن پوش کے افتتاحی مضمون نگاہِ بازگشت)

''افسانہ نویس کا فرض ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے اندر نئی بصیرت پیدا کرے اور حقائق کے پوشیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالے''

مجنوں کے افسانوں میں انگریزی کے مشہور ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی جھلک ملتی ہے جسمیں ٹالسٹائے کے علاوہ بہت سے مصنف شامل ہیں، ان کے بہت سے افسانوں کے پڑھنے سے طبع زادگی کا احساس ہوتا ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کی رنگینیوں کو چاشنی سے پُر کر کے قارئین کے لئے پیش کیا ہے، جس سے اس کی لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے،

افسانہ نگار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ اس طرح منسلک رکھے کہ اس کو احساس نہ ہونے پائے کہ وہ افسانہ کا جز نہیں ہے، مجنوں نے اس بات کی کوشش کی ہے مگر اکثر و بیشتر خلا کا احساس ہوتا ہے مگر داخلیت کا پہلو پیش پیش ہے ان کے افسانوں کا مجموعہ (خواب وخیال) اور سمن پوش، اردو افسانہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے افسانوں میں (بازگشت) سراب اور سوگوارِ شباب، ایسے افسانہ ہیں جسمیں ہارڈی کے انداز بیان کی جھلکیاں ہیں، مجنوں چونکہ انگریزی کے استادرہ چکے تھے اور زبان پر اچھی دسترس تھی اس لئے انھوں نے اپنے افسانہ میں انگریزی ادب سے اسی طرح فائدہ اٹھایا ہے جس طرح فراق نے اردو شاعری میں نئی رومانی فضا پیدا کی ہے،

افسانوں میں اکثر و بیشتر مصنف کے زندگی کے حقائق اور سرگوشیوں کا دخل پایا جاتا ہے، مجنوں نے اس سے کنارہ کشی کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے،

''فسانہ کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے نہ کہ کسی نظریہ یا فلسفہ پر''

مجنوں کی اپنی افسانہ نویسی کے دس سالہ زندگی میں یہ کاوش برابر بنی رہی کہ اردو ادب میں مغربی ادب کے معیاری افسانے آجائیں جس سے یہ زبان ادبی میدان میں دوسری زبانوں سے آنکھ ملا سکے جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا نئی نسل نے اردو

افسانوں میں ایک نئی روح پھونکی جس سے مجنوں کی افسانہ نگاری مجروح ہوئی اور وہ اس میدان کو چھوڑ کر تنقید کی طرف راغب ہو گئے مگر افسانوی دنیا سے نکلنے کے بعد بھی مجنوں عشق و محبت کے مضامین سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔

بیسویں صدی میں تین ہستیاں فراقؔ، مجنوںؔ، اور نیازؔ، کی گزری ہیں جنھوں نے اردو ادب کو نئی روح عطا کی مجنوںؔ نے روایت کے دائرے سے نکل کر سماجی طاقتوں کو قبول کیا تھا، فراقؔ کے وہاں یہ تاثر ملتا ہے مگر وہ اپنی تاثرات پر توجہ مرکوز رکھتے تھے، نیاز اردو شاعری میں بڑی حد تک لفظوں کے روایتی استعمال کے دلدادہ تھے اور نثری میدان میں لفظی تشکیلات اور غیر روایتی فکری میلانات کے ہم نوا تھے بقول ڈاکٹر حنیف فوق۔

''لیکن ان تینوں کی مشترکہ کاوشوں سے ادب میں لفظی اہتمام اور معنوی زیبائی کی طرف توجہ دینے کے رجحان کو فروغ ہو رہا تھا اور ادب کا ہر طالب علم بقدر لب و دنداں ان کی تحریروں سے استفادہ کر رہا تھا'' [۱]

مجنوںؔ کے افسانوں کے کردار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قارئین کو رومان اور عینیت کی فضا تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں اگر پریم چند نے حقیقت پسندی کا دامن پکڑا تو مجنوں نے جمالیاتی اور رومان پسندی کے ساتھ فلسفۂ زندگی کا دامن نہیں چھوڑا (سمن پوش) ہمارے لئے آئینہ دار ہے، ان کا افسانہ نقش ناہید نے وہ نقوش چھوڑے ہیں جس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا بقول سید ابوالخیر کشفی،

''ایک طرف عظیم بیگ چغتائی، حجاب امتیاز علی، اور شفیق الرحمٰن کے افسانوں کی رومانی فضاؤں میں ڈیرا ڈالنے کی تمنا دل میں ابھرتی اور دوسری طرف مجنوںؔ صاحب کے افسانوں کی غم آلود فضا ایک چادر کی طرح ہمارے وجود کو اپنے اندر لپیٹ لیتی'' [۲]

---

[۱] (ماہنامہ (دائرہ) [۲] (ماہنامہ (دائرے) سید ابوالخیر کشفی ص ۳۶، ۳۷)

انگریزی ادب میں (تامس ہارڈی) کے کارناموں کو مجنوں نے ہی ہم تک پہنچایا ان کو یہ امید تھی کہ آنے والے ادیب اردو ادب میں نئی شاہراہوں کو جنم دیں گے، مجنوں صاحب کے افسانوں نے جو رومانی اور عندلیبی فضا قائم کی اس سے قاری بہت متاثر ہوتا ہے اور دنیا کی اس رنگین فضاؤں میں اسے غم و اندوہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، مجنوں مقامی مناظر کے قائل تھے اور یہ بات انھوں نے تامس ہارڈی سے سیکھی، مجنوں کے افسانوں کا جائے وقوع منجھریا اور پلدہ کے وہ مناظر ہیں جس کے درمیان ان کا بچپن گزرا یہ مواضعات سنت کبیر نگر میں ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی کو وہ گلیاں یاد آتی ہیں جہاں اس کے بچپن نے سانس لیا تھا اسی لئے ان کے افسانوں میں انھیں مواضعات کے جغرفیائی حالات کا ذکر ہے، اسی سے مجنوں کی شناخت ممکن ہو پائی ہے، مجنوں صاحب چونکہ کئی زمانوں اور زبانوں کے شناساں تھے اس لئے اس سے انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان کے قدم افسانوی ادب سے نکل کر اردو کے دوسرے ادبیات تک پہنچے اور اپنی تحریروں میں حقیقت پسندی کے ساتھ طبیعت کا رومانی انداز نہ تج سکے،

مجنوں حقیقت میں فلسفی نہیں تھے مگر فلسفہ نگاری کا گر جانتے تھے انھوں نے مسائلِ حیات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کاوش کی تھی، اس میدان میں انگریزی ادب نے مجنوں کی بڑی رہنمائی کی ہے چونکہ مجنوں منطق سے بھی شناساں تھے، ان سب نے مل کر مجنوں کی تحریروں میں فلسفیانہ رنگ پیدا کر دیا مگر ان کی تحریروں نے جمالیاتی طرزِ ادا کو قائم رکھا جس سے ان کی تحریروں میں بڑی شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔

یونان اس دور میں فلسفہ کا مرکز بنا ہوا تھا چونکہ مجنوں فلسفہ کے دلدادہ تھے اس سلسلے میں انھیں یونان کے فلسفیوں کی تحریروں اور تجربوں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا جسکی وجہ سے سقراط جیسے فلسفیوں سے کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، مجنوں کے فلسفیانہ نظریہ کی تائید ان کے اس اقتباس سے ہوتی ہے،

''میں حدوث ارتقاء کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں میں زندگی اور اسکے تمام شعبوں کو تاریخ کی روشنی میں دیکھتا رہا اور تاریخ کو ایک مائل بہ ارتقاء قوت مانتا رہا، میں مارکس کے مطالعے سے بہت پہلے زندگی کی جدلیاتی کا احساس رکھتا تھا اور اس نظامِ فکر کا قائل تھا جس کو جدلیات کا نام دیا جاتا ہے'' [1]

اس سلسلے میں مجنوں نے فلسفیوں اور مفکروں کے نظریات کا عمیق جائزہ لیا جس نے ان کی فلسفیانہ تحریروں میں روح پھونک دی، غالب کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ (دانائے اسرارِ کائنات ہیں) اسی لئے انھوں نے غالب کو اردو کا پہلا مفکر شاعر مانا ہے، غالب کے بارے میں مجنوں کا تصور، شوپنہار سے منسلک ہے، مجنوں نے فلسفیوں میں شوپنہار کے نظریاتی مطالعے کو اولیت دی تھی اس کی وجہ وہ یہ لکھتے ہیں۔

''میں نے سب سے شوپنہار کو کیوں منتخب کیا؟ اس کے دو اسباب ہیں ایک تو میں کسی زمانے میں شوپنہار کا مطالعہ بڑے اشتیاق وانہماک سے کر چکا تھا دوسرے شوپنہار کے فلسفلہ پر ادبیت اس قدر غالب ہے کہ فلسفہ کی خشکی اور بے کیفی محسوس نہیں ہونے پاتی، شوپنہار کا فلسفہ فلسفہ نہیں بلکہ اچھی خاصی شاعری ہے ....میں نے شوپنہار پر جو خامہ فرسائی کی ہے اس سے ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ میں اس کے فلسفۂ کائنات اور انسانی زندگی کے مسئلے کا حل سمجھتا ہوں'' [2]

مجنوں نے شوپنہار پر جو مختصر کتاب لکھی اس میں مغربی ممالک کے فلسفیوں میں ڈیکارت سے لے کر شوپنہار تک کی تاریخ مرتب کر دی، یونان کے مفکروں میں سقراط اور تقریباً ڈھائی ہزار سال میں جتنے فلسفی گزرے ہیں ان کی تاریخ اس طرح

---

[1] (ماہنامہ قومی زبان جون ۸۹ء سحر انصاری) [2] (قومی زبان سحر انصاری ص ۲۸)

سے مرتب کی جس کے علم وفن کے شعاعوں سے دینا اجالے کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس میں شک نہیں کہ مجنوں صاحب کی یہ تحریریں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، برگساں جو فرانس کا مشہور فلسفی تھا جس نے تھیوری آف ٹائم سے بہت سے مفکروں کو روشناس کرایا ڈاکٹر اقبال تو اس کے اس موثرانہ کھوج سے بہت متفکر تھے اور ان کی نظم مسجد قرطبہ اس کی شاہد ہے، مجنوں بھی اس کے خیالات اور تحریروں سے بہت متاثر تھے ان کا ایک طویل مضمون فلسفہ حدوث کے نام سے شائع ہوا جس میں انھوں نے اس کی حمایت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلسل حرکت وتغیر کا تصور پیش کرتا ہے جس میں صوفیانہ جھلک ہے، مجنوں پہلے بھی میر اثر، غنیمت کنجاہی اور آسی غازی پوری پر تصوف کے ہی حوالے سے تفصیلی مضامین لکھ چکے تھے موصوف نے اپنے اس تصور کو تاریخ جمالیات میں بڑی کشادگی سے جگہ دی، انیس سالہ عمر میں انھوں نے مختلف ادبیات پر ایسے ترجے اور تاثرات پیش کئے تھے جس سے فراق گورکھپوری اور امرناتھ جھا جیسی شخصیت انگشت بدنداں ہوگئیں، مجنوں کی فلسیانہ تحریریں تصور حیات اور موت حسن اور صناعی کا تقابلی مطالعہ کر کے ایک مثبت نتیجہ برآمد کرنے میں ہماری بہت مدد کرسکتی ہیں۔

مجنوں کی فلسفیانہ تحریروں کے بعد ان کی افسانہ نگاری قابل ذکر ہی نہیں قابل قدر ہے مجنوں نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا وہ وقت ان کی طفلی کا تھا لیکن کچھ ہستیاں اس میدان میں آچکی تھیں جن کے قلم کی ہر لکیروں نے اس فن میں نئے نئے زاویے پیدا کئے اس میدان میں پریم چند، سدرشن لال، علی عباس چشتی قابل ذکر ہیں، جب افسانہ قدرتی ماحول سے نکل کر آگے بڑھا تو اسکی درخشندگی میں چار چاند لگانے کے لئے مجنوں گورکھپوری، سجاد حیدر، نیاز فتح پوری وغیرہ اس میدان میں آچکے تھے، افسانہ کا تعلق جب انسانی جبلتوں سے ہوگیا تو اس کوزے میں سماجی، سیاسی اور جمالیاتی تصورات نے اپنی جگہ بنالی، اگر نیاز فتح پوری نے حسن شناسی کی شدت کو

محسوس کیا تو مجنوں نے رومانی لچک پیدا کی، چونکہ افسانہ کے ابتدائی دور میں ملک بری طرح سے سامریت کا شکار تھا ہر کس و ناکس اس سے متاثر تھا اس دور میں جو افسانے وجود میں آئے اس کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے پہلے حصے میں پریم چند اور اعظم کرپوری وغیرہ آتے ہیں، دوسرے حصے میں وہ افسانہ نگار آتے ہیں جس نے افسانوں میں حسن اور رومانیت کو جنم دیا جس میں مجنوں، نیاز، امتیاز علی، پیش پیش ہیں، اس افسانہ نگاروں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے افسانوی رنگ کو اور رنگین کرنے کے لئے دوسری زبانوں کے افسانوں کا ترجمہ اردو زبان میں کیا جس سے افسانوی ادب کافی مستفیض ہوا۔

افسانوں میں جب شعر منثور کا رنگ چھا گیا تو اس سلسلے میں مجنوں کا کہنا ہے۔

> ''کچھ طبع زاد تھے کچھ آفاقی جمہوریت کے علمبردار والٹ ہیٹمیسن اور کچھ ٹیگور سے متاثر ہو کر لکھے گئے اور ٹیگور کے منظومات بالخصوص باغیاں سے ترجمے تھے'' [۱]

ڈاکٹر شاہین فردوس نے بڑی کاوش کے بعد مجنوں گورکھپوری کے دو شعر منثور حاصل کیے جس میں سے ایک قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

> ''جو میں تجھے نذر کر رہا ہوں اسی کنج باغ کے پھولوں سے تیار کیا گیا ہے جہاں کبھی تو اور میں پہروں مصروف گلگشت رہا کرتے تھے اب وہاں ایک کلی بھی شگفتہ نہیں ہوتی مگر گزرے ہوئے زمانے کی یاد البتہ باقی ہے۔
>
> ہاں یہ پھول اسی چمن سے چنے گئے ہیں جہاں ہر چند کہ ہم وقت موعودہ سے پہلے ہی پہنچ جایا کرتے تھے مگر پھر بھی یہ خیال کرتے تھے کہ بہت دیر ہو گئی جہاں گرمیوں کی چاندنی راتوں میں گھنٹوں ایک

---

[۱] (خودنوشت نمبر ۲ رشمولہ ارمغان مجنوں جلد اول، ص ۶۳)

دوسرے کے ساتھ اس قدر محو رہتے تھے کہ ہمارا لمحہ افتراق جو ہمیشہ کافی وقت گزر جانے کے بعد آتا تھا ہمیں قبل از وقت معلوم ہوتا تھا اس ہار کے کچھ پھول جھیل کے کنارے سے بھی لئے گئے ہیں،، ،، ،، دیکھتے ہوئے ہم دن بھر محو خرام رہتے اور جوں جوں کہ شام قریب آتی ایک دوسرے کو آسودہ نگاہوں سے دیکھ کر حسرت سے کہا کرتے کاش محبت کے دیوتا میں اتنی طاقت ہوتی کہ کم از کم ہماری حیات معاشقہ کے ایک ہی لمحہ کو جو افکار و آلام سے بالکل معریٰ ہو اپنی طلائی زنجیروں میں ہمیشہ کے لئے پابند کر سکتا'' [1]

اردو شاعری سے نکلنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں مجنوں نے جو افسانے لکھے وہ قابل ستائش اس نظریے سے ہیں کہ اس نے افسانوں کو وسیع النظر ہی نہیں کی بلکہ پارۂ ادب بن کر سامنے آیا، نیاز فتح پوری اس افسانے کو دیکھنے کے بعد قائل ہو گئے کہ مجنوں میں افسانہ لکھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ہے اور اس مرکز پر پہنچنے کے بعد مجنوں کے افسانہ نویسی کا سلسلہ شروع ہوا اس ڈیڑھ چھٹاک آدمی میں قدرت نے اتنی صلاحیت عطا کی تھی کہ وہ ہر میدان میں اپنی آب و تاب چھوڑ گیا، بقول مجنوںؔ

''میرا ذاتی رجحان فلسفہ اور تنقید کی طرف تھا لیکن ایک طرف تو نیاز صاحب نے دوسری طرف عوام کی روش نے مجھے افسانہ طرازی کی طرف مائل کر دیا''

زندگی بھر اس بات پر اٹل رہے کہ افسانہ ان کی زندگی کا نصب العین نہیں تھا، یہی وہ سوچ تھی جس نے مجنوں کو افسانہ کی طرف سے تنقید کی طرف رجوع کیا،

مجنوں کے افسانہ نگاری کا سلسلہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۵ء پر ختم ہوتا ہے، (گہنا) ان کا پہلا افسانہ ہے گو (زیدی کا حشر) کو مجنوں پہلا افسانہ کہتے ہیں جو

---

[1] (مجنوں گورکھپوری حیات اور ادبی خدمات، ص ۹۴)

حقیقت میں وہ ایک ناولٹ ہے، ۱۹۳۵ء کے بعد بھی مجنوں نے کچھ افسانہ لکھے ہیں جن کی تعداد بہت کم ہے چونکہ مجنوں ذہین طالب علم تھے اس لئے ان کے افسانوں میں انگریزی ادب کی جھلکیاں جگہ بجگہ ملتی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ انگریزی افسانوں سے بہت متاثر تھے اسی تسلسل میں اگر فراقؔ گورکھپوری کو دیکھا جائے تو ان کی شاعری پر بھی انگریزی شعراء کے شاعری کا خاصہ اثر دکھائی دیتا ہے یہ سب ان لوگوں کی انگریزی ادب پر اچھی دسترس کا نتیجہ ہے مجنوں نے جہاں افسانے لکھے ہیں وہیں انگریزی افسانوں کا ترجمہ بھی اردو افسانوں کے فروغ کے لئے کیا ہے مجنوں کا اپنے افسانوں کے بارے میں یہ کہنا ہے۔

''میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے تمام افسانے طبعزاد ہوتے ہیں لیکن ان افسانوں کے علاوہ جن کو میں نے خاص طور سے ہارڈی کے افسانے سامنے رکھ کر لکھے ہیں، میرا کوئی افسانہ کسی خاص فسانہ سے ماخوذ بھی نہیں ہوتا'' [۱]

مجنوں کے افسانوں کا رنگ وروپ دوسرے افسانہ نگاروں سے منفرد ہے افسانوں کے کچھ تخیلات تو خود ان کے پروردہ ہیں اور اپنے کچھ افسانوں کے لئے وہ دوسروں کے ممنون ہیں ان کے تخیلاتی اور روحانی پرواز کے سلسلے میں جو افسانے آتے ہیں اس میں سبز پری، سمن پوش، محبت کا جوگ، حسن شاہ وغیرہ اور جن افسانوں کے لئے وہ دوسروں کے ممنون ہیں وہ جشن عروسی، مدفنِ تمنا، اور بیگانہ وغیرہ ہیں، مجنوں کے افسانے وہ سرچشمہ ہیں، جس میں مغربی ومشرقی ادب کی ایسی آمیزش ہے جس نے ادب میں ایک نئی جدت طرازی کا انکشاف کیا ان کے افسانے (بازگشت) اور اس سے ملتے جلتے افسانے ان کے آبائی وطن پلدہ اور منجھریا، گورکھپور اور مشرقی اطراف کی حسین فضاؤں کی نشاندہی کرتے ہیں، اردو کے بہت سے ادیبوں نے

---

[۱] (ناچار مسلمان شو۔ خواب وخیال، ص ۲۴)

مجنوں کی مشرقی فضا میں مغربی تہذیب وتمدن اور ادب کے بیش بہا خزانوں سے اردو افسانوں کو منور کرنے کا جو شرف حاصل ہے اس کے بڑے مداح ہیں، مجنوں کا افسانہ (زیدی کا حشر) اپنے کچھ فنی خامیوں کی وجہ سے دوبارہ اشاعت میں نہ آسکا مگر اردو اکیڈمی ناگپور کے ایڈیٹر نیازی صاحب کے سفارش پر مجنوں نے مجبوراً ان کو دوبارہ اشاعت کے لئے دیدیا اس افسانے میں صوفیہ اور زیدی کی ناکام محبت اس دنیا کو خیر باد کہہ جاتی ہے مگر صوفیہ کا شوہر حسنینؔ اب بھی ان فضاؤں میں سانس لے رہا تھا مجنوں اس مجرم کو کبھی معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے بقول مجنوںؔ۔

> ''اس افسانے کو اپنے نام سے منسوب کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے مواد کے ساتھ ساتھ مجنوں کو اس کی ادق اور مشکل تحریر سے بھی گلہ ہے''

مجنوں کا افسانہ (گہنا) فراق گورکھپوری کی کاوش کا نتیجہ ہے فراقؔ کی رباعیات، اور نظمیں ہندوستانی ماحول میں اس طرح سے رچی بسی ہوئی ہیں جس نے مجنوں گورکھپوری کو بھی متاثر کیا (گہنا) اسی کا نتیجہ ہے، جس میں تامس ہارڈیؔ کا افسانہ Tess کے تاثرات اور فراق گورکھپوری کی رباعیات میں ہندوستانی کلچر کی آمیزش سے تیار ہوا افسانہ (گہنا) ہے اس کی مقبولیت میں کوئی حرف نہیں لگایا جاسکتا، مجنوں کا دوسرا افسانہ ''سمن پوش'' بھی گہنا کی طرح (نگار) میں ابتدائی دور میں چھپا تھا جس کے روحانی تصور نے قاری کو متاثر کیا گو یہ افسانہ مجنوں کی نظر میں بہت اہمیت نہیں رکھتے تھے مگر قارئین کی نظر میں خاصی اہمیت کے حامل تھے ایک بات بہت مشہور ہے کہ علی گڈھ کے طالب علم میں شفقت تخلص رکھنے والا شاعر مجنوں کے (سمن پوش) افسانہ پڑھتے پڑھتے جاں بحق ہوگیا، اس افسانے نے اس بات کو آشکار کردیا کہ مجنوں اس بات کے قائل تھے کہ جسم خاکی کے چلے جانے کے بعد روحیں اس دنیا میں رہ جاتی ہیں اور اپنے مقصدیت کی تکمیل میں سرگرداں رہتی

ہیں انھیں تخیلات سے افسانہ (سمن پوش) آراستہ ہے، طویل ضرور ہے مگر مجنوں کے قلم کی گل کاریوں نے اس کی طوالت کا احساس نہیں ہونے دیا ہے۔ حسنین کا انجام مجنوں کا تیسرا افسانہ کہا جاتا ہے، اس افسانے کی نوعیت یہ ہے کہ (زیدی کا حشر) نے ان میں اضطرابی کیفیت پیدا کر دی تھی اور وہ اضطراب سے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے، دوسرے ٹاشٹائے کی ناول کی ہیروئن نے مجنوں کے دل و دماغ پر اپنے کردار کا جو اثر چھوڑا تھا ان کا افسانہ (حسنین کا انجام) اسی کا نتیجہ ہے، مجنوں چاہتے تھے کہ اردو افسانوں میں انگریزی افسانوں کے بہترین عنصر کو اس طرح سے پرویا جائے جس سے اردو ادب کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے، انھوں نے اپنے افسانوں کے ہیروئن کو موت کے آغوش میں سلا دیا اور خود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

"حسنین کی آنکھوں پر سے پردے ہٹ گئے تو اندھوں کی
طرح کائنات اس کی نگاہ میں ایک سیاہ داغ ہو کر رہ گئی"۔[1]

حقیقت میں مجنوں نے حسنین کے انجام میں زیدی کا حشر میں ہونے والی کمزوریوں کو دور کیا ہے، ۱۹۲۷ء کے افسانوں میں (گوہر محبت) جو ایچ ویلسن کے فسانے پر منحصر ہے دوسرا افسانہ (تم میرے ہو) مختلف رسائل میں شائع ہوا اس کے علاوہ اسی سال رواں میں مجنوں کے جو افسانے (نگار) میں شائع ہوئے وہ حسب ذیل ہیں،

مراد، حسن شاہ، جشن عروشی، اور ہتیا، جس میں افسانہ ہتیا کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے کیونکہ اس میں ہندو معاشرہ کی تصویر کشی ہے جس میں تامس ہارڈی کی جدت طرازیوں کو مجنوں نے افسانے میں اس طرح پرویا کہ وہ ہارڈی کے لقب سے یاد کئے جانے لگے، ان کی تحریریں ان کی انفرادیت کی غمازی کرتے ہیں، مجنوں کے افسانے کا دور ان کی جوانی کی سرگوشیوں کا دور تھا (ہتیا) افسانہ اپنی محرک کردار، قدرتی مناظر

---

[1] (حسنین کا انجام پرچہ نگار ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۲۸)

اور دلفریب ماحول کی اپج ہے اسی لئے یہ افسانہ اہمیت کا حامل ہے اس کے کردار و پلاٹ اس طرح پردے پر آئے کہ ان کی جاذبیت بڑھتی ہی چلی گئی، مجنوں کے افسانے میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت کا دامن نہیں چھوڑتے ان کے افسانہ خواب و خیال، شکست بے صدا، بے گانہ، مدفن تمنا، اور محبت کی قربانیاں وغیرہ مجنوں کے خالص طبعزاد افسانوں میں ہیں کم ہی افسانے ایسے ملیں گے جس پر خامہ فرسائی ادیبوں اور ناقدوں نے نہ کی ہو، مجنوں کی تحریروں نے یہ ثابت کردیا کہ ان کے افسانوں میں چاندنی کی لطافت اور دھوپ کی آب و تاب کی آمیزش ہے مگر محبت میں خلوت اور جلوت کا کوئی تصور نہیں ہے اس کی منزل تو عدم کی منزل سے جا ملتی ہے، افسانہ (محبت کی قربانیاں) جب الوطنی کا بہترین نمونہ ہے، اس افسانے کے ہیرو کے چند کلمات سنئے جو انگریزوں کی گرفت میں آنے کے بعد وطن کے مجاہدوں سے کہہ رہا ہے۔

> ''میں چلا لیکن تم لوگ ہو، یہ حریت اور غلامی کی جنگ یہ فاقہ کشی او شکم سیری کی لڑائی رکنے نہ پائے جب تک تمھارے جسم میں ایک قطرہ لہو بھی باقی ہے اس وقت تک پیچھے نہ ہٹو'' [۱]

مجنوں نے افسانوں کے علاوہ نصف درجن سے زیادہ ناولٹ بھی لکھے جس میں دو ناولٹ (یادِ ایام) اور تنہائی، قابل ذکر ہیں مگر یہ ناولٹ رسالوں میں مکمل نہ چھپ سکی اور قارئین کو اسی پر اکتفا کرنا پڑا ۱۹۲۸ء میں نگار میں ان کی ناولٹ (مندرجہ ضیاع و فلک در چہ خیال) قسطوار چھپا تھا بعد میں اس نے کتابی صورت اختیار کرلی اور اس کا نام صیدِ زبوں، رکھا گیا، یہی ترتیب بازگشت کی بھی تھی دونوں افسانوں کے مواد میں کافی یکسانیت ہے، ادریس جب اپنی پہلی محبت میں ناکام ہوجاتا ہے اور جدائی کی آگ میں جلتا ہے، مریم اس کی زندگی میں آتی ہے جس سے اس کو یہ احساس پیدا ہوجاتا ہے کہ اس کی محبت کی ابتداء اب ہوئی ہے، مالتی نے احمد کی زندگی میں جو

---

[۱] (محبت کی قربانیاں مجموعۂ خیال و خواب ص ۲۰۷)

ولولہ پیدا کیا وہ افسانہ کا دوسرا رخ ہے مجنوں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ناکام محبت کس طرح سے حقیقی محبت کے دریچوں تک پہنچتی ہے لیکن مجنوں محبت کی عظیم سرحدوں کو پار کرنے میں ناکامیاب رہے اور دونوں افسانوں کا اختتام المیہ پر کر دیا۔

۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۴ء میں (محبت کی فریب کاریاں) کے نام سے مجنوں کا افسانہ پرچہ (ایوان) میں قسط وار شائع ہوا تھا، جس کا نام ناولٹ کا روپ دے کر (سراب) رکھا گیا، یہ ناولٹ سماج کی ان کرتیوں اور بد حالی کی نشاندہی کرتی ے جو مجنوں نے سماج میں علی الاعلان یہ دیکھا اس ناولٹ کا پس منظر یہ ہے کہ یوسف جو ناولٹ کا ہیرو ہے بیک وقت کئی لڑکیوں سے محبت کا ڈھونگ رچتا ہے اور ان کو شادی کے سنہرے خوابوں سے مسرور کرتا ہے مگر اس کی محبت ایک ناکام ہو کر رہ گئی، یوسف اپنی ناکامئی محبت کو سماج کی فتح اور محبت کی شکست تسلیم کرتا ہے ۱۹۳۱ء میں ان کا افسانہ (گردش) جو حقیقتاً دنیاوی گردشوں کا شکار رہا وہ (ایوان) میں شائع ہوا تھا، سوگوارِ شباب بھی قسط وار اسی رسالہ میں شائع ہوا، دونوں افسانوں نے بعد ازاں کتابی شکل لے لی، مجنوں کی زندگی خود المیہ کا افسانہ ہے زمانۂ تعلیم میں ان کی پریشانیاں والد کی بے نظم زندگی، اولادوں کی بے توجہی، گھر چھوٹا، وطن چھوٹا، ملک چھوٹا، مگر زخموں کو اس طرح برداشت کیا کہ خونی رشتوں کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی ان کی زندگی مجاہدانہ ضرور تھی، مگر المناک اور غم واندوہ سے بھری تھی، اسی لئے ان کے افسانے ان کی زندگی کا پرتو ہیں، جس میں غم واندوہ کا سفر زیادہ ہے اور مسکراہٹوں کا فقدان ہے۔

مجنوں نے اپنے افسانے (مدفن تمنا) میں اپنے کردار نگاری کے جوہر دکھائے ہیں مجنوں کو چونکہ قلم پر بہت زیادہ قدرت حاصل تھی اس لئے کردار نگاری پر ان کا ملکہ تھا نجمہ اور سلیمان کے طرز زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ ان کے فہم وادراک کا پرتو ہے (بتیا) میں برہمنوں کی ریشہ دوانیوں نے سرلا پر اس قدر اثر ڈالا کہ اس نے

خاموشی اختیار کر لی مگر موصوف نے سرلا کے کردار کو اس طرح آشکار کیا ہے جو ایک حقیقت شناس ادب نواز ہی کر سکتا ہے، سرلا کو اپنی حقیقت کا پتا چل چکا تھا اور مجنوں اس کے کردار کے تانے بانے سے کافی آسودہ نظر آتے جس کا اعتراف انھوں نے رسالہ نگار رنومبر ۱۹۲۷ء کے افسانہ ہتیا میں کیا ہے، آمنہ کی وفا شعاری کو انھوں نے اپنے افسانے (مراد) میں آشکار کیا ہے اس افسانہ میں آمنہ کا دو اشخاص سے تعلق کو مجنوں نے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ ان کے کردار نگاری کی مثال ہے۔

جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں کہ مجنوں انگریزی ادب اور انگریزی افسانوں کے رسیا ہی نہیں بلکہ اچھے جانکار تھے اس لئے ان کے افسانوں میں مبلغ کے صدا پہلے بلند ہوتی ہے پھر افسانہ کے کلمے لکھے جاتے ہیں، کہیں کہیں افسانوں سے پہلے کی تمہیدیں اگر حذف کر دی جائیں تو بھی افسانہ کی ہیئت پر کچھ اثر نہیں ہوتا یہ تو موصوف کی سوچ ہے جو ان کے حصے میں مغربی ادب سے آئی، افسانہ کے اجزائے ترتیبی افسانوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں مجنوں کے افسانوں میں ان اصولوں کا بڑی تندہی سے احترام کیا گیا ہے منظر کشی ہو، پلاٹ یا کردار ہو افسانہ کی نفسیاتی کیفیت ان سب کو مجنوں نے بخوبی ادا کیا ہے، افسانہ اتنے محرک ہیں کہ قاری کو ذرا بھی تکان محسوس نہیں ہوتی، مجنوں کے افسانہ المیہ کی بھرپور پذیرائی کرتے ہیں اس لئے پورے افسانہ میں ایسی فضا تیار ہو جاتی ہے جس سے غم واندوہ کا ایسا دور دورہ ہوتا ہے جس سے ان کے المیہ کی حکایت کو اور تقویت مل جاتی ہے ان کے المیہ افسانوں میں منظر نگاری، جزئیات اور کردار نگاری کی بہترین مثالیں مل جاتی ہیں۔

مجنوں کی جائے پیدائش پلدہ (آمی) ندی کے کنارے بسا ہے ندی سے بہت سے نالے برائے آب پاشی نکالے گئے ہیں اور کچھ قدرتی ہیں جب غروب آفتاب قریب ہوتا ہے تو گاؤں کے مزدور اور محنت کش لوگ ان نالوں کے کنارے جمع ہو جاتے ہیں اور اپنی تکان کو مٹانے کے لئے بادۂ و ساغر کا سہارا لیتے ہیں اس

ماحول میں اتنی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں جس میں الف سے یا تک تختی مکمل ہو جاتی ہے کبھی کبھی یہ محفلیں غیظ و غضب کی شکار بھی ہو جاتی ہیں، مجنوں نے ان مناظر اور جزئیات کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے جس میں ماحول کی جذباتی اور قلبی لگاؤ کا بہترین عنصر ملتا ہے یہ سب ان کے ادب لطیف کی نشاندہی کرتے ہیں، مجنوں کے افسانوں میں دوسرے افسانہ نگاروں سے انفرادیت پائی جاتی ہے وہ کسی بھی چیز کو اس حد تک لیجانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے مبالغہ کا گمان نہ پیدا ہو، شاہین فردوس نے اپنی کتاب (مجنوں گورکھپوری حیات اور ادبی خدمات، کے صفحہ ۱۳۳ پر ان کی یہ تحریر قلم بند کی ہے۔

> ''شاعروں نے جتنے سراپے لکھے ہیں، مصوروں نے جتنی تصویریں کھینچی ہیں، سنگ تراشوں نے جتنے مجسمے بنائے ہیں ان میں حسین ترین خصوصیات کو الگ کر لیجئے اور یہ سب کچھ اور ان سے بھی زیادہ میری پریما میں موجود تھیں''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجنوں کو اپنی تحریروں کا کتنا پاس تھا، وہ یہ جانتے تھے کہ افسانے تلقین و تبلیغ سے یکسر خالی ہوتے ہیں مگر اس کے فکری عنصر میں ایسی بصیرت افروز حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں جو قارئین کی زندگی کی راہوں میں تنہا نہیں چھوڑتے ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا پہلو اس لئے روشن ہو گیا کہ وہ فلسفہ اور علمی گتھیوں کو بڑے سلیقگی سے سلجھانے کی اہلیت رکھتے تھے اس لئے مجنوں کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ زندگی کے فلسفہ اور ٹھوس حقائق کی نشاندہی ملتی ہے مگر افسانوں میں ذہنی بوجھ کا احتمال بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور افسانہ کی لطافت اور رومانیت زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، مرزا حامد بیگ کی یہ بات سچ ہے کہ افسانے میں فلسفیانہ بحثیں افسانوں سے الگ تھلگ محسوس ہوتی ہیں مگر اچھا افسانہ نگار اس میں وہ روانی اور گداختگی پیدا کر دیتا ہے جس کے اثر سے قاری کی شگفتگی

کم نہیں ہوتی ہے چونکہ مجنوں ماہر فن تھے اس لئے ان دشواریوں سے نکلنا خوب جانتے تھے، افسانہ (بیگانہ) اور حسن شاہ اس کے شاہد ہیں، مجنوں کے افسانوں میں رومانیت بدرجۂ اتم ہے کچھ تو انگریزی ادب کی دین ہے دوئم اس زمانے کی اردو ادب کی رومان پسند تحریروں کا اثر ہے، جیسے مہدی افادی وغیرہ سوئم مجنوں خود رومان پسند شخصیت کے مالک تھے جوان کی ناکام محبت کی غمازی کرتی ہے، ان کے افسانوں میں جدائی وصل پر حاوی ہے اور یہ جدائی موسم گرما کی دھوپ کی طرح لمبی اور صبر آزما ہوتی ہے اسی لئے ان کے افسانوں کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ مجنوں کے افسانوں میں محبت ایک مختصر سی لمحاتی مسرت ہے اس کے بعد تکلیف و آزمائش کا دور شروع ہو جاتا ہے، نیاز کے افسانوں میں محبت کی گل پاشیاں بدرجۂ اتم ہیں، دوسری طرف مجنوں یاس و حرماں کے شکار ہیں نیاز کے افسانے ہمارے دلوں کو وقتی طور پر مسرور کرتے ہیں مگر مجنوں کے افسانے عشق و محبت کی چوہدیوں سے نکل کر زندگی کے تلخ حقائق سے بھی روشناس کراتے ہیں، مجنوں کے خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ محبت وصل کا نام نہیں ہے بلکہ جدائی سے آب دار تیغ بنا دیتی ہے میرا خیال ہے کہ اتصال محبت کی موت ہے۔ جس پر مجنوں پیش پیش رہے۔

پریم چند کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت حقیقت شناس ہیں اپنے آس پاس کی جیتی جاگتی تصویروں کو بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، سماج کی کروتیوں کو اجاگر کرتے ہیں مجنوں اس حقیقت کے پابند تو نہیں ہیں مگر ان کے کچھ افسانے جیسے (حتیا) (سراب) میں ان سماجی برائیوں کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے افسانہ نگاروں کی دور بینی اور تجربۂ زندگی وہ نکات ہیں جس کے اتار چڑھاؤ سے افسانوں میں زندگی کی لہر دوڑائی جاتی ہے۔

انسانوں کی نفسیات ماحول سے پیدا ہونے والے کو اکب پیش ونظر کے حالات یہ سب افسانہ نگار کی نظر سے اوجھل نہیں ہونے پاتی، مجنوں نے بھی مرد و زن

کے نفسیاتی پہلوؤں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور بڑی زندہ دلی اور دلیری سے وہ انسانی جھروکوں میں جھانکتے اور اس میں سے مقصدیت کو نکالنے کا گر جانتے تھے مگر مقصدیت کا تانا بانہ اس نفیس انداز سے بنتے تھے کہ بات قاری کے دل میں اتر جائے اور افسانہ بھی مجروح نہ ہو سکے مجنوں کا خیال ہے۔

"عورت جب ایک بار محبت میں خراب ہو جاتی ہے تو پھر اپنی اصلاح گوارہ نہیں کر سکتی، ڈوب کر ابھرنا اور مرجھا کر پنپنا اس کے لئے رسوائی سے بدتر ہوتا ہے صرف موت اس کو بچا سکتی ہے"۔[1]

مجنوں اس بات کے قائل تھے کہ محبت نام ہے دو ہستیوں کے ہر لحاظ سے ایک ہو جانے کا! سمن پوش، جوان کے افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں روحانیت کے ساتھ نفسیات کے عنصر بھی پائے جاتے ہیں، مغربی ممالک میں مختلف انجمنوں کے محققوں نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ روح ایک لافانی شئے ہے جس کی ہیئت اور کارکردگی میں جسم کو چھوڑنے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، مجنوں نے اسی فلسفۂ حیات کو اپنے مختلف افسانوں میں باندھنے کی کوشش کی ہے جیسے (آب وگل سے دور) اسطرح کے افسانے سمن پوش کی زینت، حقیقت میں یہ روحانی افسانے افسانہ نگار کی فکری عنصر کی اڑان ہے جس میں حقیقت کم ہے اور سوچ زیادہ ہے، ان افسانوں کا اگر غور سے جائزہ لیا جائے تو یہ ذہنی افتراء کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے افسانہ نگار آوارہ کون کی حکایت کا مربی معلوم ہوتا ہے، اور روح کے بارے میں فرسودہ خیالات سے متاثر ہے، حسن شاہ اور سعیدہ کا افسانہ ان کی پینتیس سالہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے حسن شاہ جب جنوں کی سرحد پار کر لیتا ہے اور حقیقت کا دروازہ وا ہو جاتا ہے تو اس کے پاس موت کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا مجنوں نے اس افسانہ کو بڑی خندہ پیشانی سے بیان کیا ہے ان کے کردار بڑے محرک ہیں اور نفسیاتی جزئیات کے حامل ہیں۔

---

[1] (حسنین کا انجام نگار ۱۹۲۶ء ص ۲۷)

مجنوں کے قلم میں انفرادیت بدرجۂ اتم تھی اور داخلیت کا پہلو نمایاں تھا اس لئے ان کے افسانوں میں ان کی شبیہہ مکمل نظر آتی ہے، ادیبوں اور قارئین کا گمان ہے کہ مجنوں کے افسانوں میں ان کی آپ بیتی کی پرچھائیاں جا بجا نظر آتی ہیں کچھ حد تک تو یہ بات اثر پذیر ہو سکتی ہے کیونکہ مجنوں کی پوری زندگی غم واندوہ کرب واضطراب کا سنگم ہے، مگر ان کے اندر جو استقلال اور قوت تھی اس نے ان کے اندرونی اضطراب پر پردہ ڈال دیا تھا، مجنوں ایک ایسے جوہری تھے جو باطنی جوہر کو پہچانتے تھے، صحیح اور غلط کے امتیاز کے گر جانتے تھے، (یاد ایام) میں معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں مجسم موجود ہیں ''شہاب'' کے پردے میں مجنوں نے اس بات کا احساس دلانے کی کاوش کی ہے کہ ذی علم اور ہوش مند کردار الگ الگ رہتا ہے کیونکہ وہ کسی کو اپنی سطح پر نہیں پاتا، مجنوں کے افسانوی کردار حقیقی تاثرات کو اپنے لفظوں میں ادا کرنے کی کاوش کرتے ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ مجنوں نے اپنی بات کو قارئین تک پہنچانے کے لئے ان کرداروں کا سہارہ لیا ہے، مجنوں کے افسانے زندگی اور موت کے شکنجے میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں جس سے انسانی بے بسی اور لاچاری کا احساس ہوتا ہے انھوں نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ۔

بنا لیتا ہے موج خونِ دل سے ایک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

(اصغر گونڈوی)

یہ شعر بہت حد تک ان کی کارکردگی کی عکاسی کرتا ہے، انھوں نے افسانے خوب سے خوب تر لکھے ہیں جو ان کی ادبی صلاحیتوں کے شعور کا انکشاف کرتی ہیں، حقیقت میں انھوں نے اپنے جوہری خامہ سے بہت آبگینے ادب میں پروئے ہیں جسے ادبی دنیا قیامت تک یاد رکھے گی۔

(۷)

مجنوں بحیثیت نقاد

تنقید نگاری

افسانوں کی دنیا خیر باد کہنے کے بعد مجنوں کی زندگی میں تنقید نگاری کا دور شروع ہوتا ہے یہ بات اور ہے کہ درمیان میں خطوط نویسی بھی ہمراہ تھی جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

۱۹۳۰ء سے ہی مجنوں کے میلان میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی شاہی امام باڑہ گورکھپور کے متولی شاہ جواد علی شاہ جو ایک باذوق انسان تھے کی سرپرستی میں مجنوں کا رسالہ (ایوان) اردو ادب کی خدمت کے لئے ادبی میدان میں آگیا، مجنوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اس رسالہ کو ادب کی توانائی کا وسیلہ بنایا جائے، مجنوں کو اس بات کا احساس تھا کہ تنقید نگاری ایک ایسا فن ہے جو دودھ اور پانی کو الگ کرتی ہے بقول ڈاکٹر محمد یٰسین

> "ان کے تنقیدی مضامین میں تاریخی جائزہ، جمالیاتی رنگ،
> فنی بصیرت کے علاوہ فکر و تامل کے عناصر بھی غالب نظر آتے ہیں" [1]

مجنوں کے بیشتر پڑھنے والوں نے ان کی وسیع النظری، درک و بصیرت کے علاوہ ان کے عمیق مطالعہ کا اعتراف کیا ہے مجنوں نے بڑے بڑے مفکروں اور فلسفیوں کے علاوہ انگریزی ادب کے سورماؤں اردو، فارسی شعراء جیسے سعدی، حافظ، مولانا روم، بیدل، میر و غالب، اقبال کے افکار و تاملات سے بھی استفادہ کیا ہے، مجنوں کی نظر میں تنقید ایک تخلیقی فن تھا، ان کی تصانیف زہر عشق، میراث، خواب و خیال مثنوی نیرنگ عشق، اور مثنوی اسرار محبت کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ شوپنہا، برگساں، اور تاریخ جمالیات کو بھی وہ تنقید کے زمرے میں شامل کرتے ہیں، موصوف کے یہی نظریات ان کے آخری دم تک قائم رہی ان کے مضامین ادب

---

[1] (مقالہ مجنوں گورکھپوری)

اور زندگی، ادب اور ترقی، ادب اور مقصد تخلیق و تنقید، حسن اور فنکاری، ادب کی جدلیاتی ماہیت نئی پرانی قدریں، زندگی اور ادب کا بحرانی دور، فن ہی کیوں، ادب اور کاروبار جدیدیت یعنی یہ سب عناصر ہمارے تنقیدی بلندی کی شاہراہیں ہموار کرتے ہیں۔

مجنوں جب غزل کی تنقید پر اترے تو وہ اردو ادب کے اعلیٰ رہنماؤں ادیبوں اور فنکاروں، شاعروں کے تخیلات سے مرعوب نہیں ہوئے اور ان سب کے درمیان سے ایک ایسا راستہ نکالا جس نے ان کی شخصیت کو پراسرار بنادیا ان کے تنقیدی مضامین جو اردو کے مایہ ناز ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ہے وہ ہماری تنقیدی سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے ان کے نزدیک غزل کیفیات ذہنی اور واردات قلبیہ کے اظہار کا بہترین وسیلہ ہے اور غزل کی نزاکت اور اس کی وسعت کے نظریہ کو قائم رکھتے ہوئے انگریزی ادب سے ہٹ کر مشرقی ادبیات اور جمالیات کو پراسرار طریقے سے تنقید کا جز بنایا ہے، مگر زمانے کے اتار چڑھاؤ کا پاس رکھا، ساتھ ہی ادب میں صالح اور صحت مند میلانات کا خیر مقدم کیا اس مین اس بات کی بندش لگادی کہ سا میلانات موقع و محل کی نزاکتوں کا احترام کریں، ڈاکٹر محمد یٰسین نے اپنے مقالے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔

”مجنوں کی تنقید میں ڈرائیڈن کا تقابلی و تجزیاتی انداز اور آرنلڈ کی طرح عصری موثرات و عوامل کو اجاگر کرنے کی کوشش نظر آتی ہے“

حقیقت میں مجنوں کا جھکاؤ جمالیاتی نظریہ پر زیادہ ہے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے میں ذرا بھی نہیں جھجھکتے ایمانداری کا یہ حال ہے کہ ادیبوں کی تصانیف اور شاعروں کے کلام کے سلسلے میں بے مروتی کی حد بھی پار کر جاتے ہیں اس لئے ان کے وہاں صداقت کا جلوہ طرہ امتیاز پر ہے ان کو اپنے قلم پر بڑا اعتماد تھا جس کو متاثر نہ ہونے دیا،

۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۸ درس و تدریس کے دوران انھوں نے اپنے ادبی کارناموں

سے ہندو پاک کی ادبی مجالس میں اپنے نام کا ڈنکا بجادیا اسی لئے ۱۹۶۸ء کے بعد جب وہ پاکستان پہنچے تو اس سلسلے میں ان پر پڑھا گیا سپاس نامہ ان کی مقبولیت کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کو اعزازی پروفیسر کی ڈگری دے کر ۱۹۷۸ء تک کے لئے کراچی یونیورسٹی سے منسلک کرلیا گیا،

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ اردو شاعری مجنوں گورکھپوری کی منزل نہ تھی بلکہ ادب سے گرویدگی کا ایک اظہار اور ان کے ذوق کا سرچشمہ تھا لیکن ان کے نثری ادب میں افسانہ، ناولٹ، نیم افسانوی تحریریں، خودنوشت، فلسفیانہ تصنیفات، تالیفات ان کے ادبی لگاؤ کا پتا دیتی ہیں مگر اس میں سے بڑھ چڑھ کر ان کا تنقیدی نظریہ ہے جس نے اردو ادب میں ایک نئے سنگ میل کی بنا ڈالی ہے بقول حنیف فوق،

""مجنوں نے مختلف میدانوں میں اپنے قلم کی روانی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن اردو ادب کو مجنوں کی سب سے بڑی دین ان کی تنقید ہے کہ اس مین ان کی شخصیت، مطالعے، تجزیہ کاری، تخیل کا ادبی اظہار، جائزہ لینے کی حیرت انگیز قوت، جمالیاتی نکتہ سنجی اور دانش عصر کے مجموعی فکر سے امتزاج نے ایسے چراغ روشن کئے ہیں جن سے ہماری نگاہیں منور ہیں"" [1]

اردو ادب میں جب ترقی پسند ادب نے سر اٹھایا جس سے شاعری، افسانہ نگاری، اور ڈرامہ نگاری متاثر ہوئی وہاں کے تنقیدی رجحانات میں بھی تبدیلی آگئی، اور ان کے نظریات آنے والے ادیبوں کے لئے مشعل راہ بنے اس زمرے میں مجنوں کے علاوہ اختر حسین رائے پوری بھی آتے ہیں۔

مجنوں اپنے ابتدائی دور سے ہی اشترا کیت کے حامی تھے اور قیام گورکھپور میں ایک کمیٹی کی تشکیل بھی کی تھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا مگر سرپرستی اور بنا ڈالنے کا سہرہ ان کے سر تھا اس سلسلے میں ان کے اشترا کی تصور کو جس چیز نے بہت متاثر کیا وہ ان کی

---

[1] (ماہنامہ دائرہ ص ۳۹ جنوری ۱۹۸۸ء)

اردو، عربی، فارسی، انگریزی ادبیات کی وسیع معلومات تھی جس نے ان کو جمالیاتی لگاؤ سے الگ نہ ہونے دیا، روسی اشتراکی نظام ادیبوں کو یہ رائے دیتا ہے کہ وہ اپنے انفرادی تصورات کو اجتماعی تصورات پر قربان کر دیں مجنوں نے اس سلسلے میں جو اپنی رائے پیش کی ہے ملاحظہ ہو۔

- ''موضوع اور مواد معاشرتی میلانات سے ملتے ہیں، صورت اور اسلوب کو ادیب کی انفرادیت مہیا کرتی ہے جب تک انسان انسان ہے اس وقت تک اس کے اندر انفرادیت باقی رہے گی اور کوئی اشتراکی یا انقلابی دستور العمل اس کو ایک دم فنا نہیں کر سکتا'' [1]

تنقیدی ادب میں مجنوں نے کئی کئی راہیں نکالنے کی کاوش کی ہے فانی پر ان کے تنقیدی مضامین اور اپنے ناولٹ میں جن شعراء کے اشعار پیش کیے ہیں ان اشعار میں بڑی تابانی آگئی ہے جو ان کی بصیرت کا انکشاف کرتی ہیں مجنوں میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف کرتے تھے جس سے ان کی انکساری کا پتہ چلتا ہے اور یہ ایک باوقار ادیب کی پہچان ہے، مجنوں نے ادب میں جو نئی نئی شاہراہیں کھولی ہیں اس سے ان کی ادبی لگاؤ اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے مجنوں چونکہ جمالیاتی تصور کے دلدادہ تھے اس لئے انھوں نے اردو تنقیدوں میں بھی وہ شگفتگی پیدا کی ہے جس سے قاری بے حد مسرور ہوتا ہے اور اس کے لگاؤ اور دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے، مجنوں کی تنقید نگاری کو اہلِ ادب دو صیغے میں بانٹتے ہیں اول ان کی نظریاتی تنقید دوم ان کی عملی تنقید۔

مجنوں سے قبل تنقیدی معیار محدود تھا، سر سیدؔ اور حالیؔ نے اصلاح کے پہلو کو اپنے قلم کی زیبائش بنائی، آزادؔ اور نیازؔ نے جمالیاتی فن کو اجاگر کیا جہاں تک شبلی کا سوال ہے انھوں نے فن اور مقصد کو ترجیح دی، مجنوں کو یہ میدان بہت سونا نظر آیا ایک

---

[1] (رسالہ دائرے جنوری ۱۹۸۸ء ص ۳۶)

آدھ سورما جو اس میدان میں تھے انھوں نے ادب کے صرف ایک ہی گوشے کو ہوا دی اس لئے یہ میدان مجنوں کے لیئے بڑا سود مند ثابت ہوا ان کو اس بات کو احساس تھا وہ یہاں اپنی قلم کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔

مجنوں نثر کے شیدائی تھے اور ان کا میلان ایسے علمی موضوعات کی طرف تھا جن کا اردو میں فقدان تھا مجنوں نے اس فقدان کو اپنے مندرجہ ذیل تحریروں سے شاداب کرنے کی کاوش کی جس میں شوپنہار، تنقیدی حاشئے، اقبال، ادب اور زندگی، افسانہ، نکات مجنوں، دوش وفردا، پردیسی کے خطوط، (جلد اول) شعر وغزل، غزل سرا، نقوش وافکار، تاریخ جمالیات، پردیسی کے خطوط (جلد دوم) غالب شخص اور شاعر، قابل ذکر ہیں، تنقید ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق راقم اور قاری دونوں سے ہوتا ہے راقم کی دور بینی، تجسس اور پہنچ تنقید کی اہم کڑیاں ہیں وہ کہاں تک اپنی گرفت میں لے پاتا ہے اس سے اس کی تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، قاری کا فعل یہ ہے کہ وہ تنقید کے اتار چڑھاؤ سے کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری انگریزی ادیبوں مفکروں کے کارناموں سے بخوبی واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس سے متاثر بھی تھے انھوں نے (جیمس اسکاٹ) کے خیالات کی وضاحت اس طرح سے ہے،

> ''نقاد کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ شاعر یا ادیب کے کسی کارنامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے الٹے پاؤں واپس جا چکے تا کہ وہ خود اپنی تخلیقی تخیل سے کام لے کر آغاز سے نقطۂ تکمیل تک اس کارنامہ کا تجزیہ کر کے اس کو سمجھ اور سمجھا سکے''

اس وضاحت سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نقاد کی ذمہ داریاں بہت نازک راستوں سے گزرتی ہیں اسے اس کائنات کا بخوبی مطالعہ ہونا چاہئے، تا کہ وہ شاعروں، ادیبوں اور تخلیق کاروں کی نبض کو نہ صرف پکڑ سکے بلکہ اس کی رفتار کو

بھی محسوس کر سکے جس سے مواد کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے، اچھی
اور بلند پایہ تخلیق کے لئے تنقیدی صلاحیت بدرجۂ اتم ہونی چاہئے، انگریزی تنقید
نگار (ایلیٹ) اور اردو میں کلیم الدین احمد کلیم نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ تنقیدی
صلاحیت رکھنے والے فنکار دوسرے فنکاروں سے بہتر ہوتے ہیں، ایسے تنقید نگار جن
کو تنقیدی نظریہ ورثہ میں ملا ہو یا خداداد نعمت کا نتیجہ ہو یا اکتسابی صلاحیت سے فیض
یاب ہوا ایسے تنقید نگار کو اپنے مذاق سے بہرہ ور ہونے کا پورا موقع ملتا ہے، مجنوں
گورکھپوری انھیں دونوں صفتوں سے مرکب تھے مجنوں نے اس بات کو اپنی
کارگزاریوں سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اردو ادب کے ہر صنف میں ایک امتیازی
حیثیت کے مالک ہیں،

(نظریاتی تنقید)

مجنوں کی تنقید نگاری نے شاید ہی ادب کے کسی گوشے کو فراموش کیا ہو ان کے تنقید کی خصوصیت یہ ہے کہ تشنگی سے پرہیز کیا جائے، شگفتگی کو بروئے کار لایا جائے اور تصنیف کے اس آستانہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، جہاں سے مصنف کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں، انھوں نے تنقید کے سارے پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے اپنی تحریروں میں سمویا ہے اور نظریاتی تنقید کا حق ادا کر دیا ہے، نظریاتی تنقید ہی وہ زینہ ہے جس سے تنقید نگاری عملی تنقید کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے نظریاتی تنقید کے سلسلے میں مجنوں کی تحریریں ۱۹۳۶ء میں ادب کے میدان میں آچکی تھیں بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری،

> ''مجنوں نظریاتی تنقید کے میدانمیں ۱۹۲۹ء میں داخل ہو چکے تھے چونکہ ان کے تنقید کا ابتدائی دور تھا اس لئے اس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی اور مجنوں کا سن بھی ۲۵ رسال سے زیادہ کا نہ تھا ۱۹۲۹ء میں ان کا (نگار) میں مضمون (زندگی) کے نام سے شائع ہوا جو ان کے تنقید کے میدان میں داخلیت کی بنا ہے جس میں مجنوں کی مختلف صلاحیتیں بھرپور نظر آتی ہیں چاہے جمالیاتی عنصر ہو یا جدلیاتی، اس مضمون میں انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور اپنی فلسفیانہ رائے سے آگاہ کیا ہے، ان کا خیال تھا کہ انسان کی فلاح و بہودی اس میں ہے کہ وہ اپنی بے چینیوں میں فلاح کی راہ ڈھونڈھے تو اپنے کرب و اضطراب میں سکون اور راحت نصیب ہوگی، اگر اس خیال کو انسان پس پشت ڈالدیتا ہے تو انسانی فلاح کی راہیں خود بخود معدوم ہو جاتی ہیں، جہاں تک مجنوں کے ادب کے نظریہ کا سوال ہے وہ

ادب میں مقصدیت کو ترجیح دیتے ہیں صرف فہم وادراک کو ہوا دینے والے ادب انسانی لذتوں کو فروغ دینے والے ادب یا ادب کے وقتی شرارے مجنوں کی دسترس سے بہت دور ہیں وہ حقیقت پسند انسان تھے اور حقیقت نگاری ان کے قلم کا جوہر تھا انھوں نے کسی کی خوش فہمی کو راہ نہیں دی وہ دودھ اور پانی میں تمیز خوب کرتے تھے وہ ادب کو زندگی پر فوقیت دیتے تھے، اور اس کی رہنمائی کو زندگی کا ضروری عنصر سمجھتے تھے کیوں کہ ادب فکر وفن کا مجموعہ ہے مجنوں نے اپنے خیالات کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

"ادب اس کے مقصد کا تعلق سطحی نہیں ہے بلکہ اس کی مثال
اس چمکتے ہوئے سورج کی ہے جس میں گرمی اور روشنی دونوں مضمر ہے
اگر ایک کو الگ کر دیا جائے تو وہ ایک خطرناک سمت کی نشاندہی کرے گا"

مجنوں نے اپنے مقالہ شعر وغزل میں شاعری سے متعلق تمام باتوں کی فلسفیانہ انداز میں وضاحت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ شاعری بھی ادب کی ایک صنف ہے اس لئے اس کی اچھائی یا برائی کا پرتو ادب پر بھی پڑتا ہے، مجنوں ادب برائے زندگی کے حامی تھے اور ادب برائے ادب کو کسی بھی حالت میں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ شاعری میں بھی اس جزلاینفک کا سایہ ہو جس میں بیٹھ کر آدمی چند لمحہ محظوظ ہو سکے اور صرف نقش فریادی بن کر نہ رہ جائے، مجنوں کا کہنا ہے ادب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور یہ ترک وتپیا کی پیداوار بھی نہیں ہے یہ ایک ایسا صاف شفاف چشمہ ہے جس میں زندگی کی رنگینیاں بل کھاتی نظر آتی ہیں، ادیب کی صحرا نوردی یا زندگی کے حقائق سے دوچار ہونا اس کی بیراگی اور جوگی پن کی دلیل ہے اس کی مجاہدانہ زندگی خود بخود بروئے کار آجاتی ہے، مجنوں نے اپنے مقالہ (ادب اور زندگی) میں یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ کون سے خاص خاص کارنامے اور ان کی

خصوصیات ہیں جو ادب کی روح رواں بن سکتی ہیں ادب اپنے وقت کا علمبردار ہوتا ہے اس کے آئینہ میں مختلف ادوار کی خوبیوں کو دیکھا جا سکتا ہے، مجنوں کے نزدیک واقعیت ایک ایسا جز ہے جو تخیلات سے آمیزش کے بعد ادب کی روح بن جاتا ہے ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند ادب نے سر اٹھایا تو مارکسیٹ اور اشتراکیت کا دور آ گیا اور اس نے دو فرقوں کو جنم دیا ایک فرقہ اشتراکیت کا حامی تھا تو دوسرا مخالف تھا، اور یہ چشمک نہ ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی، مجنوں بھی ترقی پسند ادب کے حامی تھے مگر انھوں نے پرانی روایتوں کو بالائے طاق نہیں رکھ دیا تھا وہ درمیانی روش اختیار کرنا خوب جانتے تھے اور اسی مشاقی نے ان کو ایک اعلیٰ تنقید نگار کا درجہ عطا کیا اس میں شک نہیں کہ مجنوں کی تحریروں نے ادب کے مداحوں کو بڑی سوجھ بوجھ کی باتوں سے آگاہ کیا اور نوجوانوں کے سامنے ترقی پسند ادب کی پنکھڑیوں کو اس طرح بکھیرا کہ اس سے ان کو آگے راہ ہموار کرنے میں کافی مدد ملے،

سردار جعفری کا کہنا ہے کہ مجنوں نے ترقی پسند ادب کے توسیع میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کے تنقیدی مضامین اس کی نشاندہی کرتے ہیں، مجنوں کا خیال تھا کہ ادب کو اجتماعی شعور اور جمہوری ذہنیت کا آئینہ ہونا چاہئے، اس وقت دنیا کو ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہماری مادی اور واقعاتی زندگی کی فلاح و ترقی میں معاون ثابت ہو ادب بیک وقت حال کی آواز اور مستقبل کی بشارت ہے،

مجنوں تواریخی تسلسل کے حامی تھے اس علم کے بغیر ادیب اور نقاد اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے اس لئے ضروری ہے کہ ماضی کی زندہ یاد حال کے تمام اکتسابات اس کے نظر کے سامنے گردش کرتے رہیں جس کی مدد سے وہ نئی فکر کو جنم دے سکے ماضی، حال اور مستقبل ایک تسبیح کے تین اٹوٹ دانے ہیں ایک کی کمی دوسرے پر بھاری پڑے گی ان تینوں کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے انھیں کے روابط سے تہذیبیں جنم لیتی ہیں اور نئی نئی مشعلیں روشن ہوتی ہیں کوئی بھی نقاد یا شاعر اس کی مدد کے بغیر قوم یا

سماج کو ان حقیقتوں سے آشنا نہیں کر سکتا، مجنوں کی دور اندیشی اور ان کے علمی مطالعوں نے ان کو بھٹکنے نہیں دیا ان کا مقالہ (تاریخ اور تخلیق) ایک مثال ہے،

مجنوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نظام قدرت میں جو بھدا پن تھا اسکو انسان نے دور کیا ہے اور اپنی مشقتوں اور ریاضتوں سے خلقت کو سنوارا ہے اس سلسلے میں انھوں نے کوتاہ بینی سے کام لیا ہے، قدرت ہی نے انسان کو وہ شعور عطا کیا جس نے دنیا کی سجاوٹ میں کوئی کمی باقی نہیں رکھی انسانی شعور کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا، کہ انسان کے درجات الگ الگ ہیں، سب نے چاند اور سیاروں پر کمندیں نہیں ڈالی اور مختلف ایجادات کے بانی نہیں بنے اس واحد مطلق نے ان کے دل و دماغ میں وہ شعور عطا کیا جس نے دنیا کو رنگین بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اگر حیات انسانی کا جائزہ لیا جائے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آہستہ آہستہ سماجی نظام بہتر ہوتا گیا جس سے انسانی ترقیات متاثر ہوئی، مختلف علوم نے جنم لیا لوگوں میں ادبی شعور پیدا ہوا، رفتہ رفتہ انسانی سماج ترقیات کی منزل طے کرتا گیا ادبیات اور شاعری میں انوکھا پن آتا گیا،

دنیا کی کوئی بھی چیز ایک جگہ پر ٹکی نہیں رہتی اس میں تبدیلیاں اور تغیرات آتے رہتے ہیں یہ نظام قدرت ہے کہ اگر یہ تغیرات نہ آتے تو یہ دنیا اور اس سے متعلق علم وادب ترقیات کی منزل تک پہونچنے میں ناکام رہتے اس تغیر میں خیر کا پہلو زیادہ مضمر ہے جس سے مجنوں کے ساتھ ساتھ ہر ماہر فن نے فیض اٹھایا مجنوں اشتراکیت پسند ضرور تھے جس کا کھل کر اعتراف انھوں نے پردیسی کے خطوط میں کیا ہے مگر ان کے تحریروں میں اشتراکی نظام کی وہ پائداری نظر نہیں آتی جس سے ایک مفکر اور وقت شناس ادیب کو ملحد کے کٹ گھرے میں لا کھڑا کرے مجنوں نے آدم کو دنیا میں آنے کا احساس تو کیا مگر ان کے وجوہات کو نظر انداز کر دیا موصوف کو اشتراکی نظام کی خوبیاں تو خوب نظر آئیں مگر ان کے اندرونی تلاطم کو نہیں دیکھا وہ موج مضطر کی گہرائیوں میں

مست خواب نہیں تھی بلکہ اس نے انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا بڑے چھوٹے کی تفریق مٹانے کا علمبردار بننا تو بہت آسان ہے مگر عملی جامہ مشکل ہے، روس اس اشتراکی نظام کی بہترین نظیر ہے

مجنوں نے اشتراکی نظام کے ہر پہلو کا جائزہ لیا ہے اور یہ کہنے سے مطلق دریغ نہیں کیا۔

"اگر اب ہم صنعتی جبر و استبداد کے شکار ہونے والے ہیں تو مجھے یہ کہنے میں مطلق پس و پیش نہیں کہ انسانی دنیا کی نئی گت اپنے تمام ادعائے ترقی و تہذیب کے باوجود پرانی گتوں سے بدتر ہوگی" [۱]

مجنوں نے ہمیشہ صحت مند انفرادیت کو ترجیح دی ان کی تنقیدی تحریریں تین سو صفحات سے زیادہ مشاہیر غزل پر ملتی ہیں جس میں شعری فن کی نزاکتوں کو اجاگر کیا گیا ہے، ترقی پسند ادب کے ماننے والوں نے ماضی کے ادیبوں کے کارناموں کو فراموش کرنے کی کوشش کی جو کسی طرح مناسب نہیں ہے ماضی کا ہو کے رہ جانا ادب کے لئے بہتر نہیں ہے مجنوں نے ماضی پرستی کی مثال دماغی عارضہ جسے نسیان کہتے ہیں سے دی ہے ماضی کے دریچوں کو وا رکھنے سے حال اور مستقبل کے پر بہار ماحول کو توانائی ملتی ہے۔ جس سے ترقی پسند ادیب یا جمال پرست سب ایک نئی شاہراہ کو جنم دے سکتے ہیں مجنوں نے اسی گنگ وجمن کے سنگم سے ایسی زرخیز مٹیاں نکالی ہیں جس نے اردو ادب کے چمن کو بڑی توانائی بخشی موصوف نے اپنے مقالہ (حسن اور فنکاری) میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور مشاہیر قلم کو گرفت میں لیتے ہوئے حسن کی رونق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، حسن کی تشریح میں رخ اور زاویۂ نظر کا دخل ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے ماضی اور حال کی چیزوں کا تقابل پیش کیا ہے جس سے اس کی صناعی وقت کے گزرنے کے ساتھ بہتر سے بہتر ہوتی جاتی

---

[۱] (پردیسی کے خطوط جلد اول ص ۹۴)

ہے مگر یہ بات ہر صنعت پر لاگو نہیں ہوتی کچھ صنعتیں ایسی ٹھوس اور پائدار ہوتی ہیں جو ماضی کے وجود کو توانائی بخشتی ہیں اور کچھ چیزیں ایسی سبک سیر ہو جاتی ہیں جو حال کی جمال پرستی کی بنا بن گئی ہیں اگر حسن کو لامحدودیت کا درجہ حاصل ہے تو ہمارا شعور حسن بھی اس سے کمتر نہیں ہے،

فنکاری کے بارے میں مجنوں نے جو بات کہی ہے اس میں حقیقت کی جھلک ہے کہ وہ حال کو اس طرح تشکیل دیتی ہے کہ مستقبل روشن نظر آئے فنکاری حسن کی طرح ماحول کی پروردہ ہے اس لئے اس میں تغیراتی عنصر پائے جاتے ہیں جو حالات کے پیش نظر اپنے محرکات کا افشا کرتے جاتے ہیں جس سے انسانی بصیرت اس کو ادب کے سانچے میں ڈھالنے کی اہل ہو جاتی ہے مصحفی کی شاعری کے پس منظر میں مجنوں کے یہ تأثرات اہمیت رکھتے ہیں،

''شاعر اور نقاد دونوں کی نظر ادب کے ان اجزاء پر ہونی چاہئے جن میں بقاء اور ارتقا کی صلاحیت ہو''

بنائے ادب کی تشریح کیا ہے، کی تشریح کے سلسلے میں مجنوں نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ شاعر آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی کے فن کو اولیت کا درجہ دیتا ہے جب کہ شاعری کی رمزیت میں جامعیت اور ہمہ گیری لازم ہے اور یہی بلاغت کی ضامن بنتی ہے، آپ بیتی کو جگ بیتی بنانا فن شاعری نہیں ہے اس سے بہت سی خرابیاں وجود میں آتی ہیں شاعری کا فن تو وہ ہے جس کو سنتے ہی سامعین وجد میں آجائیں اور اسکی بالیدگی پر عش عش کریں، ادیب اور شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار اور تحریریں ایک زمانہ سے نکل کر دوسرے زمانے میں داخلیت کی اہلیت رکھتی ہوں اور ان میں ایسے عناصر ہونے چاہئیں جو پوری قوم اور ماحول کا احاطہ کئے رہیں، مجنوں کے خطوط ان باتوں کی غمازی کرتے ہیں جس میں انھوں نے بڑی برجستگی سے خطوط کے توسل سے اپنے تنقیدی اور ادبی خیالات کو قارئین ادب

نواز اور ادب شناس تک پہنچانے کی کاوش کی ہے، مجنوں کا خیال کہ شاعری کے لئے ایسی زبان ضروری ہے جس میں استعارہ مضمر ہو جو اشعار میں بلاغت پیدا کرتی ہے، سادگی شاعری کی جان ہے شاعر کا کمال یہ ہے کہ اپنے اشعار کو ایسے سادگی کا جامہ پہنائے جس سے اشعار میں ایسی اضطرابی کیفیت پیدا ہو جائے جسے ہر فرد بآسانی محسوس کر سکے، غزل اس کی زندہ جاوید مثال ہے جو اپنے دو مصرعوں میں زندگی کے حقائق کو بڑے پر تکلف انداز سے افشا کرتی ہے، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی نے مجنوں کے تنقیدی نظریہ کی جامعیت کو بڑی فوقیت دی ہے کیونکہ موصوف میں صلاحیت تھی کہ الف سے لے کر یا تک سارے تصورات کو اپنے تنقید کی بندش سے نکلنے نہیں دیتے،

عملی تنقید

تنقید کے دو باب ہیں ایک کو نظری تنقید کا نام دیا گیا ہے دوسرے حصہ کو عملی تنقید کہا گیا ہے۔ جہاں تک نظری تنقید کا سوال ہے اس پر اچھی بحث ہو چکی ہے جس میں کہیں کہیں عملی تنقید کے چھینٹیں بھی نظر آتی ہیں، مجنوں کے عملی تنقید کا دوران کی سترہ سال کی عمر میں شروع ہو چکا تھا اس ۰۰ر کے مضامین جیسے (رونے والا فلسفی) رسالہ نقیب بدایوں میں پہلے پہل شائع ہوا جس میں ہیراقلیطس کے تبدیلی زمانہ کے تصور کی تشریح کی ہے زمانے کے تغیرات اور تبدیلیاں امروز وفردا کے حالات پر منحصر ہیں جس کو دن ورات نے ممکن بنایا ہے محمد علی صدیقی نے مجنوں کے اس مضمون پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ سے کیا ہے

> ''جب مجنوں نے (رونے والا فلسفی) کے عنوان سے اپنا پہلا مقالہ تیار کیا تو جدید اردو ادب میں مہتم بالشان طور پر علم ودانش کے اہم معالے میں من وتو کا معاملہ ختم ہو کر رہ گیا'' [۱]

انگریزی ادب میں قدرتی مناظر کی عکاسی جس انداز میں ورڈسورتھ نے کی ہے اس سے مجنوں بہت متاثر تھے ۱۹۲۶ء میں جوان کا مضمون (ورڈسورتھ) پر شائع ہوا اس سے ان کے لگاؤ کا پتہ چلتا ہے ان کا یہ خیال ہے کہ کسی معزز شاعر جس کا تعلق مشرق یا مغرب سے ہوان کے کارناموں کا صحیح جائزہ پیش کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ان کی زندگی کے ہر دریچوں کو وا کردیں اس طرح سے ان کے کارناموں کی ایک سچی تصویر پیش کی جاسکتی ہے، مجنوں اپنے ابتدائی ادبی سفر میں ہی مغربی فلسفی اور دوسرے اہلِ قلم کی کارگزاریوں سے ہمکنار ہو چکے تھے جیسے (برگساں، شوپنہار، تاریخ جمالیات وغیرہ جہاں تک شوپنہار کا سوال ہے مجنوں نے اس کے فلسفۂ حیات

---

۱ (ارمغان مجنوں جلد دوم ص ۸۰)

کے ساتھ ساتھ ان کے عظیم کارناموں کو اردو ادب میں داخلیت کا درجہ عطا کیا اور یہ ان کی شخصیت کا عنصر تھا کہ وہ اس پُر پیچ فلسفی کی فلسفیانہ تحریروں کو تشریح اور تنقید کے ساتھ اردو ادب میں بڑی سلیقگی سے پیش کیا ہے اس طرح کے مضامین جو اردو ادب میں مجنوں کے توسل سے آئے وہ مغربی مفکروں کی دین ہے۔

مجنوں کے تنقیدی دور کا سلسلہ باقاعدہ ۱۹۳۰ء سے شروع ہوا ان کے تنقیدی مضامین مسلسل مختلف رسالوں اور کتابوں کی شکل میں اپنے زندگی کے آخری لمحات تک آتے رہے، زہر عشق ان کا سب سے پہلا تنقیدی مضمون ہے گو اس مضمون پر غم وغصہ کا اظہار کیا گیا مگر آگے چلنے کے بعد لوگوں نے اس سے استفادہ بھی حاصل کیا اور اس کے اقتباسات کی عکاسی بھی کی، خواب وخیال میں میر اثر پر مجنوں کا تنقیدی مضمون ہے جو زہر عشق کے وجود میں آیا مجنوں کو یہ گمان تھا کہ ان کا یہ تنقیدی مضمون خاصی اہمیت کا حامل ہے،

مجنوں کے ابتدائی تنقیدوں میں مثنوی نیرنگ عشق کافی اہمیت کی حامل ہے جس میں دو مردوں کی بے پناہ محبت کا جائزہ لیا گیا ہے یہاں سے مجنوں کا حقیقی تنقیدی دور نے جنم لیا، خطوط نویسی ہوں یا نثری تحریریں سب میں ان کے تنقیدی نقوش کی جھلکیاں ملتی ہیں، ادیبوں نے مجنوں کے تنقیدی دور کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے، دور اول ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۹ء تک ہے جو ان کا شعوری دور کہلاتا ہے ۱۹۳۹ء کے بعد مجنوں کی تنقید نگاری نے اپنا رخ موڑ لیا اور ترقی پسند ادب کے مسلک نے ان کی تنقیدوں میں اچھی راہ بنالی،

سلام سندیلوی نے مجنوں کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی یہ بات حقیقت سے پرے نہیں ہے کہ مجنوں نے تنقید نگاری میں شہرت دوام حاصل کی یہ ان کے فکری عنصر ان کے تجسس اور ادبی میلان کا نتیجہ ہے دوسری زبانوں کے ادبیات نے ان کی تنقید نگاری کو بڑی وسعت عطا کی موصوف کا کہنا ہے کہ مجنوں گورکھپوری کی تنقید میں

نیاز فتحپوری کی تاثراتی تنقید کی جھلکیاں ہیں، مگر یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ وہ اس میدان میں صرف تاثرات کی بنا کو لے کر خامہ فرسائی کی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے زندگی کے ابتدائی دور سے ہی ایسے تنقیدی مضامین منظر عام پر آئے جس نے تنقید کے ہر گوشے کو روشن کیا اور صرف تاثراتی تنقید کا ہی پہلو اجاگر نہ رہا شوپنہار کے تنقید کے سلسلے میں لکھتے ہیں،

"میرے خیال میں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے اپنے ماحول اور زمانے کے میلانات اور حادثات نے اس کے کردار کی تشکیل اور اس کے مزاج کے تعین میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے" [۱]

مجنوں کا یہ کہنا بجا ہے کہ اردو ادب میں شاعروں اور ادیبوں کے زندگی کے مفصل حالات پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے اگر میرؔ اس کے شکار ہوئے تو میر آثرؔ بھی اس سے خالی نہیں تھے، کیونکہ شاعری شاعر کے ماحول اور تربیت کا بہت اثر پڑتا ہے اور اس کی شاعری کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک صحیح طور پر یہ نہ معلوم ہو کہ اس کے شاعرانہ شعور کا ارتقا کن حوادث کے زیر تحت ہوا ہے، اثرؔ کے اس شعر نے

جو سزا دیجئے ہے بجا مجھ کو　　تجھ سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

مجنوں کے فکر و تنقید کو اور ہوا دی اور ان کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ شاعر کا دل اس کی گرفت میں نہیں ہے بلکہ وہ کسی اور پیش خیمہ کے تحت یہ شعر کہہ رہا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ محض ایک خشک زاہد گوشہ نشین تھا، شلیگل کا قول ہے کہ تنقید نگار میں سب سے بڑا اگر یہ ہونا چاہئے کہ جس پر وہ روشنی ڈال رہا ہے اس کے مخفی اور منفی پہلو سے آشنا ہو اس کی اس بات پر عمل کرنے سے مجنوں کا وقار اور بڑھ گیا، میرؔ کے بارے میں ان کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ میرؔ کے اضطراب میں ایک سکون اور سوز و گداز میں گہرائی اور اشعار ان کے سنجیدگی کا ضامن ہے۔

---

[۱] (شوپنہار ص ۳۹)

مصحفی کا شاعری کے اعلیٰ مقام سے انکار نہیں کیا جا سکتا انھوں نے متقدمین سے جو استفادہ اٹھایا اسے اپنی شاعری میں اس طرح سمویا گویا وہ ان کی راہ بن گئی، اس دور کے ناقدین نے مصحفی کے کلام میں ہر طرح کے اشعار پائے ہیں جس میں کسی طرح کی انفرادیت نہیں پائی جاتی مگر مجنوں اس سے اتفاق نہیں کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر مصحفی کے کلام کا بغور جائزہ لیا جائے تو کلام میں انفرادیت کے عنصر کی کمی نہیں ہے، اردو غزل میں رنگ اور فضا کا احساس پیدا کرانے میں مصحفی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں جس نے ان کی انفرادیت کو اجاگر کر دیا، مصحفی تو دلی کے پھول تھے لیکن جب اس پر خزاں آ گئی تو اس پھول نے لکھنؤ کی راہ لی اور ان کی کاوش نے اپنی شاعری میں دلّی، لکھنؤ کی شاعرانہ خصوصیت کو اسطرح سمویا جس میں دونوں دبستانوں کا مزہ ملنے لگا، مگر ان کی سب سے بڑی خام خیالی نے ان کی شاعری کو دھکا پہنچایا وہ جرأت اور انشاء سے زور آزمائی تھی جو ان کے میلان کے خلاف تھی تنقید کے میدان میں مجنوں نے تقابلی تنقید بھی پیش کی ہے جس سے ان شعراء کی بہت سی گتھیاں سلجھ گئی ہیں جیسے میر، درد، قائم اور آثر کی تقابلی تنقیدیں ہیں،

مجنوں نے جب میر و غالب کے طنزیہ اشعار پر توجہ کی تو کہنے سے گریز نہیں کیا کہ میر کے اشعار میں بے خودی کی جھلک اور غالب نے خودداری کا پاس رکھا ہے مجنوں کے یہ تنقیدی حاشئے جنوری ۱۹۳۵ء میں رسالہ ایوان میں شائع ہوئے تھے ان مضامین سے مجنوں کے تأثراتی رنگ کا تو پتا چلتا ہے مگر اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سارے تنقیدی زاوئے شعراء کے کلام کے عمیق جائزہ لینے کے بعد لکھا گیا ہے جس میں ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، جس سے شاعر کے قلم کی بیّن تصویر نظر آ جاتی ہے مجنوں نے اپنی تنقیدی مضامین میں مندرجہ ذیل باتوں پر خاص دھیان دیا ہے (۱) اگر تنقید تقابلی ہے تو شعراء کے مدارج کا اہتمام کیا گیا ہے (۲) تنقید میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ شاعر کے مستقبل کے کیا

امکانات ہیں،

مجنوں نے ایک مقالہ میں فراق کی بات کاٹتے ہوئے آتش کے بارے میں اپنی رائے کا انکشاف کیا کہ اگر آتش کا تعلق فیض آباد لکھنؤ سے نہ ہوتا اور میر، درد کے زمانے میں دلی کا منھ دیکھتے تو قائم کے تو نہیں مگر درد کے حریف بن سکتے تھے، ان کا کہنا ہے کہ وہ اردو غزل میں حافظ ہو سکتے تھے جو حقیقت تو نہیں بلکہ ایک امکانی تصور ہے،

اگر مجنوں کی تنقیدی معیار کے سلسلے میں بزم احباب نمبر ا اور نمبر ۲ کا جائزہ لیا جائے تو ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا آپ کو برملا اعتراف کرنا پڑے گا، شعری ذوق کے سلسلہ میں وہ نکتہ داں بھی ہیں اور نکتہ فہم بھی اور کلام کی گہرائیوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اشعار پر ہر زاویہ سے غور کرتے ہیں جس سے شعر کی حسن و بالیدگی کھل کر سامنے آجائے اور اچھے اور برے اشعار کی تمیز آسانی سے کی جا سکے ان کے تنقیدی مضامین سے گزرنے کے بعد قاری کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ مجنوں کے ابتدائی دور میں ہی تنقید نگاری کے تمام جوہر تقریباً آچکے تھے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مجنوں کے تنقیدی مضامین تاثراتی عنصر کے ساتھ سائنٹفک نظریات کے برابر کشش میلان کی نشاندہی کی ہے یہ تمام باتیں ان کے ترقی پسندانہ روش کا نتیجہ ہیں، مجنوں کے قلم میں جمالیاتی تصورات ابتدائی دور سے شروع ہو کر آخری مرحلہ تک رواں دواں رہا حالی کے سلسلے میں لکھتے ہیں،

> ''حالی نے بہت جلد تاب عشق کھودی اور اس گھڑی کی انتظار نہیں کیا کہ نیش عشق گوارہ ہو جاتا اور ان کو زخم جگر میں لذت ملنے لگتی وہ اس زخم کے اندمال کی کوشش میں لگ گئے'' [1]

مہدی افادی کے جمالیاتی تحریروں میں الفاظ کے استعمال کی چستی کو بڑے انوکھے انداز میں سراہا ہے اس میں ذرا بھی زیروزبر ہونے سے تحریر اپنی چاشنی کھودیتی

---

[1] (نقوش وافکار ص ۲۲۳)

ہے، مجنوں اقبال کی ابتدائی شاعری سے متاثر تھے کیونکہ ان کی شاعری کا تعلق وطن اور قوم سے تھا مجنوں کی خواہش تھی کہ اگر اقبال کی شاعری نے آبروئے گنگا کا بھرم رکھا ہوتا تو وطن جو انھیں خراج عقیدت پیش کرتا اس کی مثال مشکل تھی مگر ان کی شاعری میں رفتہ رفتہ وطنیت کا عنصر ڈوبتا گیا اور اس کی جگہ ملت اسلامیہ نے لے لی چونکہ مجنوں اشتراک پسند نظام کے قائل تھے مگر پرانی طرز کو تج نہ سکتے تھے اس لئے اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور کو انھوں نے سراہا اور جب ان کی شاعری میں نئے نئے موڑ آنے لگے تو مجنوں کے ابرو پر شکن آنا شروع ہو گیا اقبال کی تنقید پر جو ان کی مختصر کتاب ہے اس کا یہ حصہ قابل دید ہے،

''وہ بیک وقت اپنے زمانے کے مخلوق بھی تھے اور نئے زمانہ کے پروردگار بھی اگرچہ آخر میں وہ خود اپنے شکار ہو کر رہ گئے'' [۱]

مجنوں کی اسلامی معلومات سے دوری اور اشتراکی نظام سے قربت دونوں نے مل کر ایک ایسی درار پیدا کر دی جس کی وجہ سے مجنوں کے خیال پر کافی تنقید کی گئی مجنوں کے مختلف اقتباسات پر اگر نظر ڈالی جائے تو آپ عبدالشکور کی رائے سے اتفاق کریں گے کہ مجنوں کی تنقید میں جانبداری کا شائبہ اور جھلک ملتی ہے، مجنوں نے اقبال کے کلام کے عیوب کا برملا اظہار کیا ہے جس میں شاعرانہ اور فلسفیانہ نکات کی خامیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں، مجنوں نے اقبال کے کلام میں جن پرندوں کی خوبیوں کا اور ان کی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے جیسے شاہین وشہباز، عقاب وغیرہ اس بنا پر مجنوں اقبال پر فاسیشت کا الزام لگاتے ہیں، اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ ڈاکٹر عبدالحق کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ قومیں اپنی عزت وآبرو اور قوت عمل کو زندہ رکھنے کے لئے سرگرمی عمل رہتی ہیں مجنوں نے کبوتر کے جھپٹنے کا مزہ تو دیکھا اور یہ نہیں محسوس کیا کہ اقبال کو کبوتر کے لہو سے کوئی تعلق نہیں تھا

---

[۱] (اقبال ص ۴۳)

بلکہ کبوتر کے کارگردگی کا احساس تھا چونکہ

اقبال دمادم رواں ہے یم زندگی کے قائل تھے وہ ہر چیز کی حرکت کو زندگی سے تعبیر کرتے تھے اگر زندگی میں حرکت کا فقدان ہو جائے تو اسے وہ موت تصور کرتے تھے اسی لئے ان کی شاعری میں زندگی کی جھلکیوں کو دکھانے کے لئے جانباز ذی روحوں کا سہارہ لیا ہے، مجنوں نے ان کے بہت سے اشعار کا غلط مطلب نکالا، اقبال خودی کی پیغمبر تھے اور خودی ان کے رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی اور یہ تعلیم انھوں نے ابوالحسن سے حاصل کی مجنوں ان کے اشعار کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہے مجنوں کی اقبال پر تنقید ان کے سطحی مطالعہ کی غمازی کرتی ہے اگر وہ شاعری کی گہرائیوں تک جانے کی کوشش کرتے تو ان آبدار موتیوں کو حاصل کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جاتے جو اقبال نے ملک وقوم کے لئے چھوڑے تھے۔

مجنوں کے تنقید کے دوسرے دور کی ابتداء ۱۹۳۹ء سے ہوتی ہے اس دور میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ موصوف سادگی اور پرکاری کے علمبردار تھے اور ماحول کی نوعیت کو خوب سمجھتے تھے ان کے اشعار ترقی پسندانہ محاسن کو اجاگر کرنے میں معاون ہوئے مجنوں نے ان کے سماجی تصور حالات و زندگی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ قابل قدر ہے،

مجنوں ایک دور میں ترقی پسندانہ ادب سے اتنا متاثر ہوئے کہ ان کا جوشِ جنوں کافی بڑھ گیا مگر ان کی صلاحیتوں اور علمی رجحان نے ان کو حد سے تجاوز نہیں ہونے دیا، ان کا یہ دریائے تلاطم جوئے شیر میں بدل گیا جس میں اعتدال، ٹھہراؤ اور سلیقگی کی جھلکیوں نے ان کے تنقید کے رخ کو بدل دیا نقاش کاظمی کا کہنا ہے کہ

''مجنوں کے تنقیدی مضامین میں ان کا بے کراں خلوص مطالعہ، محنت اور بے پناہ قوت ابلاغ پایا جاتا ہے'' [۱]

---

[۱] (مجنوں گورکھپوری تنقید کے آئینہ میں، مشمولہ ارمغان مجنوں۔ جلد دوم ص ۱۱۵)

رشید نثار نے مجنوں کے تنقیدی مضامین کو ادبی تھیوری کا درجہ دیا ہے کچھ نقادوں نے ان کے تنقیدی عظمت کا اعتراف کیا ہے مگر ان کو مارکسیٹ کے چنگل میں گرفتار پایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجنوں نے ترقی پسند ادب کو ہر زاویئے سے پیش کرنے کی کوشش کی جس سے مختلف ازم کی اتنی تکرار آ گئی اور قارئین کو سمجھنے میں دشواری ہوئی وسیع النظری سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ مجنوں نے اپنی بات کو بڑے سلجھے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر روس کے ادیبوں کی آزادہ روی سے مجنوں شل ہو کے رہ گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ روسی ادب بے کیف اور تھکا دینے والا ریگستان ہو کر رہ گیا انھوں نے (ادب اور زندگی) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صحیح ادب وہ ہے جس میں دونوں کا امتزاج ہو دونوں کے امتزاج سے ان کا مطلب انسانی فطری اور غیر فطری شعور ہے مجنوں کے تنقیدی مضامین سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ انگریزی زبان کے تنقیدی فنکاروں سے زیادہ متاثر ہیں اور انھیں کی کسوٹی پر اردو کے تنقیدی فنکاروں کا جائزہ لیتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ مجنوں ایک تقابلی تنقید نگار کے نظریہ سے اردو ادب کے تنقید نگاروں کا تقابل نہ صرف انگریزی زبان بلکہ فارسی اور اردو زبان کے دوسرے تنقید نگاروں سے مقابلہ کرنے کو وہ زیادہ اہمیت دیتے تھے تاکہ اردو زبان میں تنقید کے لئے ایک صحیح راستہ ہموار ہو سکے، حالی، مہدی اور فانی کا مقابلہ انگریزی ادیبوں سے کرتے وقت ان سارے وجوہ کو لاکھڑا کیا جس سے مقصدیت میں کوئی الجھاؤ نہ پیدا ہو کہ کسی شاعر کے سلسلے میں ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اپنی بات کھل کر نہیں کہہ سکے جیسے نظیر اور چاسر کا تقابل،

مجنوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ہمارے نقادوں نے نظیر کی شاعری کو پس پشت ڈالدیا کیونکہ وہ انسانی جبلتوں سے منسلک ہے موصوف نے ان کی شاعری میں ان کے تصورات، ان کے محاسن کلام اور ان کے قدرتِ بیان پر بڑی پر کشش روشنی ڈالی ہے جس سے نظیر کی شاعری اندھیرے سے اجالے میں آ گئی اور ان کی شاعری

قارئین کو یہ پیغام دے گئی کہ جمہوری نصب العین کیا ہے اور اس میں واقعیت کا دخل کہاں تک ہے ان کی نظمیں ہولی، دیوالی، اور بنجارہ ان کی شاعری کی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہیں، نظیر کی شاعری نے زندگی کی نمائندگی کی ہے اور ایسا ماحول کشی کی ہے جو نایاب ہے نقاش کاظمی نے مجنوں کے نظریہ کو صراہتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے نظیر کو فرش سے عرش تک پہنچادیا ہے ان کی شاعری حقیقت نگاری کا پرتو ہے نظیر غزل کے شاعر نہیں تھے ان کا پسندیدہ میدان اردو نظم تھی اسی لئے کلیم الدین احمد نے ان کی شاعرانہ خوبیوں کو سراہنے کے بعد یہ کہنے سے نہ چوکے کہ وہ اردو غزل کو نیم وحشی تصور کرتے ہیں

مجنوں سے قبل اردو تنقید کا معیار بہت سادہ اور اصلاحی ہوا کرتا تھا مجنوں نے اس میں نئے نئے زاوئے ایجاد کئے اور مضامین شاعری اور ادیبوں کے کارناموں کو ہر دریچوں سے دیکھنے کی اہمیت پر بل دیا تا کہ تحریر کا حسنِ لطف مجروح نہ ہوسکے اور اس بات کا پتا چل جائے کہ اس دودھ میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے میرؔ کی شاعری کو یاس وحرماں، رنج وغم کی شاعری بتایا گیا لیکن مجنوں نے میرؔ کی غزلیات کو (نشاط غم) سے تعبیر کیا ہے اور انھیں خدائے سخن کا درجہ دیا ہے، مجنوں کو اس بات کا احساس تھا۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

جگر اردو کے بہت کہنہ مشق شاعر تھے ان کی غزلوں میں بلا کا سرور چاشنی اور بے خودی کا عنصر ملتا ہے یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

جگر کے غزل کی مستی اور ان کے پڑھنے کا والہانہ انداز سامعین پر وجد کا عالم طاری کردیتا تھا، مگر یہ کیفیت عارضی تھی، مجنوں نے جب جگر کے کلام پر خامہ فرسائی کی تو شاعری کے خصوصیات کے ساتھ ان کی کمزوریوں کو برمحل کہنے سے عار نہیں کیا،

لکھتے ہیں،

''جگر کے اشعار سن کر ہم تلملا بھی اٹھتے ہیں اور جھوم بھی جاتے ہیں لیکن جب تامل کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سارا اثر بس جلد تک محدود تھا سوا ایک پھریری کے کچھ تھا ہی نہیں'' [1]

جگر کی شاعری میں رنگ اور شوخی، ہجر و وصال کا بھرپور امتیاز ملتا ہے مگر کیفیت شاعری انسان کی روح اور بالیدگی تک پہنچنے سے قاصر ہے، جگر کے دور کے شعراء درد، اثر، آسی اور اصغر کے کلام میں عشق مجازی کی جھلکیاں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں مگر عشق حقیقی کا گمان ناپید ہے، مجنوں کا کہنا ہے کہ ان شعرا کے کلام میں سوز و گداز کی جو چاشنی ہے اس کا راز وہ اسی مجازی محبوب کو بتاتے ہیں جو محبوب حقیقی تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

مجنوں نے اکبر کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے انھیں حیوان ظریف سے تعبیر کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ اس معیار کا شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا ان کا کہنا ہے کہ موصوف کے پاس فکر و عمل کا کوئی سنجیدہ نصاب نہیں ہے اور ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مغربی اور مشرقی تہذیب میں کون برتر ہے اور جو بھی تقابل پیش کیا ہے اس میں شبہات کی گنجائش بہت زیادہ ہے

جوش کے سلسلے میں لکھتے ہیں، جوش جدید اردو نظم میں ایک حیثیت کے مالک ہیں ان کے نظم کی دل فریبیاں قارئین کو گدگداتی بھی ہیں اور محو حیرت میں مبتلا بھی کرتی ہیں وہ الفاظ کو نگینہ بنانا جانتے ہیں مجنوں کا ان کے سلسلے میں خیال ہے

جوش کی نظمیں جدید میلانات سے معمور ہوتی ہیں اور عصری رجحانات کی آئینہ دار ہیں لوگ ان کو انقلابی شاعر تصور کرتے ہیں جو ترقی کے مطالبات سے ہم

---

[1] (پردیسی کے خطوط، ص ۴۴)

آہنگ ہیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ وہ تواریخ اور انقلاب کے صحیح تصور سے ناآشنا ہیں جس سے بغاوت کی بو آتی ہے،

مجنوںؔ اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کرتے وقت اس کے محاسن پر ہی غور نہیں کرتے بلکہ حالات، ماحول، زمانہ کی کج روی کے ساتھ اس کے نازک احساسات اور لطیف ترین جذبات کا بھی بھرم رکھتے ہیں مجنوں کا یہ وصف تھا کہ وہ ہر ایک پر قلم اٹھاتے وقت اس کے منطقی نظریات کا بھی جائزہ لیتے تھے اسی لئے فراق گورکھپوری نے مجنوں کی عقلیت کو زندہ عقلیت، اور ان کی منطقیت کو حساس منطقیت کہا ہے، خلش برنیؔ نے مجنوں کے تنقیدی محاسن کو (فکر اور جذبہ) کا نام دیا ہے

حسرتؔ کی شاعری کے بارے میں اردو ناقدین کا خیال ہے کہ وہ ایک زندہ دل شاعر تھے ان کی غزلیات میں محبوب کی جیتی جاگتی تصویر اور قلبی واردات کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں، مجنوں کہتے تھے حسرت کے کلام سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ اس کو زندگی اور محبت کی تمام مشکلوں اور آزمائشوں پر عبور حاصل ہے، زندگی کی شدید تر گھڑیاں اس کو پابہ زنجیر نہ کر سکیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نفس مطمئنہ کے کیمیائی گر سے آشنا تھے،

اصغر گونڈوی کے بارے میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ وہ لمسی کیفیات کے دل ہی دل میں قائل ہوتے ہیں اور روح کی لطافت کو جسم سے بے نیاز رکھنا چاہتے ہیں، ان کے تصورات سے ان کے شعور میں تضاد کی بنا آ گئی ہے جس کی وجہ ان کی لاشعوری تھی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس نکتہ کو ظاہر نہ کرنا چاہتے ہیں۔

یاسؔ عظیم آبادی کے ایک شعر کو مد نظر رکھتے ہوئے مجنوں نے یاس کی شاعری کی خصوصیات کا ذکر اس لہجے میں کیا ہے کہ شاعر کی خودداراتی قوت نے عزم واستقلال کا ایسا بیج بو دیا ہے کہ جس سے ان کی پوری شاعری ان کے گرفت سے پرے نہیں ہے اور شاعر معروضی طور سے بے تعلقی کے ساتھ خود اپنی حالت پر نظر ڈال سکتا ہے،

مجنوں ابتدا ہی سے اپنے مضامین کے نفسیاتی پہلوؤں میں الجھ کر نہیں رہتے بلکہ ان کی دوراندیشی، بلیغ نظری اور ادبی صلاحیت ناقدین کے ہر گوشہ کو منور کردیتی ہے،

محمود الحسن رضوی نے مجنوں کی تنقیدی بصیرت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ان کے خیال میں فن زندگی کا محض وہ عکس نہیں ہے جو کسی شخصی مزاج کے آئینے میں نظر آئے، مجنوں سماجی، اقتصادی معاشرتی اور اجتماعی عناصر کو بھی تنقید کا ضروری جز سمجھتے ہیں،

قیام گورکھپور میں ان کی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا جو تقریباً دس سال کی مدت میں تنقیدی مضامین کی شکل میں رونما ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پردیسی کے خطوط ان کے تنقیدی مضامین کا محور ہیں، پردیسی کے خطوط دو جلدوں میں ہے، جنکو اپنے تنقیدی نظریات کا بہترین وسیلہ بنایا ہے پردیسی کے خطوط ۱۹۴۷ء کے المیہ کی وہ کرب آویز حقیقت ہے جس سے مجنوں ہی نہیں بلکہ ہر حساس دل بے چین ہو کر رہ گیا تھا، موصوف کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہیں اس حادثے نے ان کی تحریروں کو بہت متاثر کیا مگر ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تاعمر جاری رہا،

پردیسی کے خطوط اسی دور کے ان کے علمی بصیرت کا نچوڑ ہے جو انھوں نے اپنے فرضی دوستوں کے سہارے سے قارئین تک پہونچایا، مجنوں کے خطوط میں مغربی مفکروں کے خیالات کی جھلکیاں ملتی ہیں، مجنوں نے فن تنقید کو افسانوی رنگ دے کر اس کی خشک اور تھکا دینے والے عنصر کو شگفتگی عطا کی اور اپنے مکتوبات میں اپنے تنقیدی نکات کو بڑے جمالیاتی اسلوب کا رنگ دے کر نئے زاویے سے پیش کیا جس میں مکتوبات کے رنگ کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت، بصیرت اور تنقیدی محاسن کا پرتو ہے،

قیام علی گڈھ کے آخری دور میں مجنوں کی تنقید نگاری مکتوبات سے ہٹ کر ایک نئی شاہ راہ پر آگئی اور ان مضامین میں ان کی تنقیدی صلاحیت اسی طرح جلوہ افروز ہے جیسا کہ گذشتہ دور میں تھی یہ اور بات ہے کہ موصوف ترقی پسند ادیبوں کی

خام خیالیوں اور ریشہ دوانیوں سے بدظن ہو گئے تھے مگر ترقی پسند ادب کے صحت مند عناصر کو سماج تک پہنچانے میں کوشاں تھے، جیسے جیسے عمر پختہ ہوتی گئی ان کی تحریروں میں پختگی کے ساتھ ادبی محاسن میں رعنائی آ گئی اس لئے اس آخری دور کو پہلے دور سے الگ رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

مجنوں کے آخری دور کی تحریریں کمیاب ہیں مگر تقریروں کی فراوانی ان کے مقصدیت کو مجروح نہ کر سکی اس دور کی سب سے اہم کتاب (غالب شخص اور شاعر) جوان کے تقریری مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کو شبنم رومانی نے کتابی شکل دی، ان کا خیال ہے کہ غالبیات کے سفر میں یہ ایک ایسا نشانِ منزل ہے۔ جس سے آگے قدم بڑھانے کے لئے ایک اور مجنوں گورکھپوری کی ضرورت ہوگی، (غالب شخص اور شاعر، میں مجنوں نے غالب کی شاعرانہ بصیرت اور فلسفۂ زندگی کے ساتھ اس دور کے سماجی حالات اور غالب کے حسب ونسب کے علاوہ ماضی کے وہ دریچے بھی کھول دیئے۔ جس کی روشنی میں حالات کا بھر پور جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ جس میں مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کا تقابلی جائزہ لیا ہے، مجنوں نے غالب کی نجی زندگی اور ذاتی مسائل کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت پر بھر پور روشنی ڈالی ہے اس کے علاوہ غالب کی نظریۂ حیات سے روشناس کرایا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک پکے اسلام پرست تھے، ذاتی کمزوریاں ان کے اعتقاد کو متزلزل نہ کر سکی مجنوں نے غالب کے اس شعر پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے،

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

جب میں غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو مغربی مفکروں اور فلسفیوں کے حقائق کا احساس ہوتا ہے اس میں برگساں کے تخلیقی ارتقاء کی یاد آتی ہے مجنوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ غالب اللہ کی وحدانیت کے قائل تھے جو اشراقیت اور مشائیت یعنی

فلسفۂ افلاطون اور ارسطو کے امتزاج کا نتیجہ تھی غالب ایک ذاتِ واحد کے پرستار تھے جو ازل سے ابد تک اس دنیا کا واحد مالک کل ہے، وہ انسانی قلبی ہمدردی کے حامل تھے، مجنوں کی غالب سے محبت اور قلبی لگاؤ ہی غالب شخص اور شاعر، کتاب کی بنا ہے مگر مجنوں کی انا نے غالب کے سلسلے میں اپنی تنقیدی نظریہ میں نہ تو کوئی بخل کیا اور نہ ہی اپنے معیار سے ہٹ کر بات کی، ان کی پرکھ ہمیشہ ہموزن رہی مجنوں کا یہ قول تھا اگر (دیوان غالب) صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے تو میں اس کو اسی طرح سے مرتب کرنے کا سلیقہ رکھتا ہوں مجنوں کو اس بات کا احساس تھا کہ غالب کی شاعری کا تعلق کسی خاص نظریہ فرقہ اور ماحول سے وابستہ نہ تھا بلکہ ان کی شاعری میں وہ سارے جواہر پارے موجود ہیں جو ان کی افضلیت کی نشاندہی کرتے ہیں، آپ کو دیوان غالب میں کم وبیش ہر طرح کے اشعار ملیں گے جو زندگی کے ہر سطح سے تعلق رکھتے ہیں مجنوں نے غالب کے اردو اشعار کے ساتھ ساتھ ان کے فارسی اشعار پر بھی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ ان کے فارسی کے متعدد اشعار کی بالیدگی، وسیع النظری اور معیاری نقطۂ نظر سے اپنی مثال آپ ہیں، مرد کے متعلق لکھتے ہیں،

مرد رہ باید کہ باشد عشق مرد
لب ترنم خیز و در دل دردِ عشق

مجنوں اس شعر کی ماہیت کا اس طرح بیان کرتے ہیں،

"میرا دعویٰ ہے کہ انسانی تہذیب کی تاریخ کے کسی دور میں کوئی ملک کوئی قوم (مرد) کا اس سے رفیع تر تصور نہیں پیش کر سکی ہے اور آج بھی مرد کا اس سے زیادہ بلند معیار کسی خطہ اور کسی زبان میں نہیں ملے گا"[۱]

میری دسترس مجنوں کے دہلیز تک تو نہیں پہنچ سکتی اس لئے غالب کے اس

---

۱ (غالب شخص اور شاعر ص ۵۱)

فارسی شعر پر مجنوں کا تنقیدی نظریہ کہاں تک حق بجانب ہے یہ تو قارئین اور ماہرین کو طے کرنا ہے،

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالب پرست ہی نہیں بلکہ ان سے بڑی عقیدت تھی، اور وہ دیوان غالب کو بھارت کی الہامی کتابوں میں گنتے تھے،

مجنوں کے تنقید کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مضامین میں دودھ اور پانی کا امتیاز بڑی آسانی سے کر لیتے تھے اس لئے بجنوری کی غالب سے والہانہ عقیدت اور نظریات کے سلسلے میں لکھا ہے، بجنوری میں تمام تر خوبیاں ہونے کے باوجود ان کی کتاب (محاسن کلامِ غالب) پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ کہنے والا ایک خطرے کا شکار ہو ہی گیا جس کو اگر غلو کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، غالب کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت مجنوں نے بڑے ادراک سے کام لیا ہے جس میں ماضی، حال، مستقبل کے سارے دریچوں کو اس طرح کھول دیا ہے کہ غالب کی صحیح شخصیت سے ادب نواز روشناس ہو سکیں، شبنم رومانی کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ مجنوں کی کتاب (شخص اور شاعر) وجود میں نہ آتی تو بھی مجنوں کا وقار تنقیدی میدان میں کم نہ ہوتا موصوف کی یہ کتاب غالبیات میں ایک نایاب اضافہ ہے اسی دور میں مجنوں نے بہت سے ادبی شہسواروں کے سلسلے میں درجنوں مضامین لکھے جس میں بابا طاہر عریاں قابل ذکر ہیں انھوں نے موصوف کی شاعرانہ بصیرت اور فنی محاسن سے ادب نواز اور قارئین کو روشناس کرایا، اردو غزلیات میں اعلیٰ مقام رکھنے والے شاعر فراقؔ اور نیازؔ جو مجنوںؔ کے بہت قریبی ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے ان کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

فراقؔ کو مجنوںؔ نابغہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان کے شعور قابلیت اور ادبی خدمات کے محسن ہی نہیں بلکہ ثنا خواں ہیں مگر ان کو اس بات کا افسوس ہے کہ ان کی عدیم الفرصتی نے اس عظیم الشان شاعر کی فنکاری کو قارئین تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے، نیازؔ کی جمالیاتی تحریریں ان کی رومانیت اور لطافت سے بھی مجنوں بہت

متاثر تھے لکھتے ہیں۔

"اردو نثر کی تاریخ میں نیاز کا اسلوب ایک زندہ قوت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہو سکتے"[1]

مجنوں سنجیدہ ادب کو زیادہ پسند کرتے تھے، مزاحیہ ادب کی طرف ان کا رجحان کم تھا اس سلسلے میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے وہ مشتاق احمد یوسفی کے طرز کی مزاح نگاری کو زیادہ ترجیح دیتے تھے اور ان کی تخلیقی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اردو ادب کا یہ مجاہد اپنی جوانی کے ایام سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار مختلف طریقے سے جا بجا کرتا رہا اور اردو ادب میں ایک صحت مند تنقید کا نظریہ قائم کیا یہ مجنوں کی دین ہے کہ اردو ادب میں مغربی تنقید نگاروں کے اسلوب کو ضم کرنے کی کاوش کی اور تنقید نگاری اپنے پرانے ماحول سے نکل کر ایک تقابلی معیار تک پہنچ گئی جو معیار اور فن کے لحاظ سے اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

---

[1] (نیاز کی نثر اور نئی نسل، مشمولہ ارمغان مجنوں جلد اول ص ۱۶۷)

(۸

مجنوں کی مکتوب نگاری

خطوط نویسی

خطوط نویسی اردو ادب کی ایک پرانی صنف ہے جس میں بہت سے ادیبوں نے اپنی جدت اور طبع جولانی کے نمونے پیش کیے ہیں اردو ادب میں خطوط نویسی کی حقیقی بنا غالب نے ڈالی، ان کے ظریفانہ خطوط، اندازِ تخاطب اور شگفتگی کا بہترین نمونہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس میدان میں غالب کے مقابل آنے کی کوشش کی مگر وہاں تک نہ پہنچ سکے، کہتے ہیں

"ارے میرن صاحب کچھ کہو گے بھی یا خفا ہی رہو گے، اگر خفا ہو تو خفگی کی وجہ بتاؤ"

یہ انداز تخاطب دیکھئے نہ القاب نہ آداب، ہر لفظ سے برجستگی اور محبت ٹپک رہی ہے، اس سے قبل خطوط میں لمبے لمبے القاب، مقفع اور مسجع عبارتیں جگہ کر چکی تھی، غالب کی ظرافت نے ان سب کو ختم کر دیا غالب کے بعد اور بہت سے ادیب اس میدان میں آئے مگر ان کے خطوط میں وہ چاشنی کہاں جو غالب نے اپنے خطوط میں پرویا ہے، اس میدان میں دوسری بالا شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے ان کے خطوط کا مظہر، غبارِ خاطر ہے، مولانا کی زندگی بہت سے عناصر سے مل کر تیار ہوئی تھی اس لئے ان کے خطوط ادب کے دوسرے صنف میں بڑی ہمہ گیری، بے ساختگی اور ان کے پرتو کی چھاپ دکھائی دیتی ہے اسی دور میں مہدی افادی بھی آتے ہیں، اگر جمالیاتی حسن اور محبت کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنی ہو تو مہدی کی کتاب (صحیفۂ محبت) قابل دید ہے اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کی بات لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ

"مہدی کے خطوط تعویز ادب بن کر حرزِ جاں کی حیثیت سے محفوظ ہیں"

چند قدم آگے بڑھیے تو مولانا عبد الماجد دریابادی کے خطوط پر آپ کی نظر پڑے گی جس سے ان کے خطوط کے معیار، ادبی لطافت اور ثقافتی کوائف کی راہ کھل جاتی ہے اسی طرح سے دیکھا جائے تو اس میدان میں بہت سے مشاہیر ادب نظر آئیں گے، انھیں میں سے مجنوں گورکھپوری کی شخصیت بھی آتی ہے، یہ وہ شخصیت ہے جس نے اردو ادب کے تقریباً سارے اصناف پر طبع آزمائی کی اور اپنا ایک مقام بنا لیا، خطوط نویسی میں بھی انھوں نے نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے اور اس کو ایک نیا زاویہ عطا کیا ہے اس سلسلے میں ان کے خطوط کی دو جلدیں (پردیسی کے خطوط) کے نام سے شائع ہو چکی ہیں، ان کے کچھ خطوط 'ارمغان مجنوں' جلد اول میں بھی ملتے ہیں یہ سارے خطوط فرضی ناموں لکھے گئے ہیں جس میں ادب کے مختلف مسائل پر ناقدانہ نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

مجنوں کے کچھ ذاتی خطوط بھی ملتے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب اور دوستوں کو لکھے ہیں ان خطوط کا دستیاب ہونا تو بہت مشکل ہے مگر ڈاکٹر شاہین فردوس نے ان کے تین ذاتی خطوط کی طرف اشارہ کیا ہے جو (قومی زبان) ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے مگر یہ عام فہم خطوط تھے جو لوگ خیر و عافیت کے لئے لکھا کرتے تھے، اسی طرح کا خط انھوں نے علی سردار جعفری کو لکھا تا،

علی سردار دعا اور سلام

تم لوگ بہت یاد آتے ہو اور جب کہ میں بار ہا کہہ چکا ہوں یاد المیہ کی روح ہے، میری زندگی اسی وجہ سے سراسر المیہ رہی ہے خدا کرے تم لوگ بہ وجود احسن خوش رہو، سلطانہ کو دعا اور پیار، قمر عالم تم کو مفصل لکھیں گے، عصمت، کیفی، مجروح اور اختر الایمان کو بہت بہت پیار ایک سطے رہ گئے تھے وہ بھی ساتھ چھوڑ کر اپنے راستے سدھار گئے،

تمھارا بدستور مجنوں گورکھپوری کراچی ۲۶ر دسمبر ۱۹۸۷ء

سردار جعفری کے نام ان کا دوسرا خط ۶ رمارچ ۱۹۸۸ء کا ہے انھوں نے ۷ر مارچ ۱۹۸۸ء کو نور گورکھپوری کے نام بھی ایک خط لکھا تھا یہ سب ان کے ذاتی خطوط ہیں، اسی طرح سے ایک خط واحد لائبریری گورکھپوری کے سرپرست واحد صاحب کی ہمت افزائی اور دل جوئی کے لئے لکھا تھا اس کا بھی ذکر مجنوں کے حالات زندگی میں ہے، اس طرح سے ہمارے سامنے مجنوں کے خطوط کا جو سرمایہ بچا وہ پردیسی کے خطوط کی دو جلدیں ہیں یا ارمغان مجنوں حصہ اول ہے ان دونوں کتابوں سے مجنوں کے خطوط نویسی کا مکمل جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مجنوں نے خطوط کی ان دونوں جلدوں میں ادب کی مختلف صنف پر اپنی ناقدانہ تأثرات کا اظہار کیا ہے اور اس بات کی کاوش کی ہے کہ خطوط بھی تنقید کی بنا بن سکتے ہیں اور یہ مکتوب نگاری کی ایک حسین کاوش ہے، مکتوبات میں فرضی ناموں کے ذریعے سے اپنی قلبی واردات کو تنقید کا جامہ پہنا کر قارئین کو ایک نئے فن سے روشناس کرایا ہے۔

مجنوں صاحب یوپی کے شہر بلیا میں حبیب احمد صدیقی کے وہاں مہمان تھے اس وقت ان کی ذہنی کشمکش نے انھیں لکھنے پر مجبور کیا چونکہ باقاعدہ تنقیدی مضامین لکھنے سے قاصر تھے اس لئے اپنی رائے کو خطوط کی شکل میں پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا اور یہی وہ موقع ہے جس نے پردیسی کے خطوط کو جنم دیا مجنوں نے پردیسی کے خطوط کے وجود میں آنے کے تین وجوہات لکھتے ہیں۔ (۱) پردیسی کے خطوط کی بنا ان کی غریب الوطنی بنی، (۲) خطوط کے ذریعے وہ اپنی رومانی اور تخیلی رگ کو آسودہ کرنا چاہتے تھے (۳) خطوط کے بنا کی وجہ یہ بھی تھی مختلف اصناف میں وہ مروجہ ہیئت کی پابندی کا لحاظ نہیں کر سکتے تھے، پردیسی کے خطوط مجنوں کے تنقیدی شغل کا آئینہ دار ہے مگر اس میں مکتوب نگاری کے جوہر پائے جاتے ہیں، مجنوں صاحب بصیرت افروز ہی نہیں تھے بلکہ علمی رجحان کے وہ آئینہ تھے جسمیں بڑے بڑے ادیبوں نے اپنی شکل دیکھنے کے بعد بڑی گھبراہٹ محسوس کی ان کی اس نئی تحریری ادا نے اردو کے

خطوط نگاری میں ایک نیا اضافہ کیا اگر غالب نے خطوط میں برجستگی، مولانا آزاد نے ادبی مسائل کی شگفتگی، مہدی افادی نے حسن پرستی اور جمالیاتی شوشوں کو جنم دیا تو مجنوں نے مکتوب نگاری میں تنقیدی مسائل کو حل کیا، یہ خطوط ہندوستان کی اس بدحالی انتشار اور سماجی کرتوتوں کا آئینہ دار ہے جو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک کے دوران وجود میں آئے، یہ دس سال کے ایام ہندوستان کے پیشانی پر وہ بدنما داغ ہیں جس سے ایک باعزت سماج چیخ اٹھا، ہر طرف آہ وبکا، قتل وغارتگری لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم تھا اور مجنوں کی جہاں بیں آنکھیں اس منظر کو برداشت نہ کرسکیں اوران کے غمگسار آنسو خطوط کی شکل میں ٹپک کر عوام سے فریاد کررہے ہیں کہ تمھیں کیا کرنا چاہئے تھا اور تم نے کیا کیا خطوط کی دونوں جلدیں درجن سے زیادہ خطوں پر مشتمل ہیں جو اپنے دور کے حالات اور ادبی مسائل پرناقدانہ نظر ڈالتی ہیں ان تمام خطوط میں زن وشو کو مخاطب کیا گیا ہے اس سے مراد ان نوجوانوں اور دوشیزاؤں سے ان کے فرائض کی یاددہانی کرائی گئی ہے جو سماج کے اہم عنصر ہیں، مجنوں کا خیال تھا کہ اس طرح کی تحریروں سے ہمارے نصب العین کی حمایت ہی نہیں بلکہ ایسی طاقت ملے گی جو سماج کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے گی، مجمع کو مخاطب کرنے کے لئے مائک کا استعمال اسی لئے کیا جاتا ہے کہ سامعین تک ان کی بات سلیقگی کے ساتھ پہنچ سکے اسی کام کے لئے مجنوں نے اپنے خطوط میں ہندوستان کے نوجوانوں اور دوشیزاؤں کا سہارہ لیا تاکہ وہ ان کی جولانئ طبع سے فائدہ اٹھاسکیں اگر وہ بزرگ حضرات سے مخاطب ہوتے تو انھیں ادب واحترام کا پاس رکھنا پڑتا اور اپنے خطوط کو وہ جمالیاتی حسن نہ دے پاتے جو قارئین کے دل ودماغ کو متاثر کرتا، جمالیاتی حسن کو مدنظر رکھتے ہوئے پردیسی کے خطوط کے دوسری جلد میں انھوں نے مختلف ناموں کا سہارہ لیا ہے جس میں ناہید، منوہر، اور گلنار وغیرہ ہیں جو ان کے خطوط کی چاشنی کو بڑھانے کی وجہ بن گئے۔

مجنوں اس دوستی کے قائل تھے جو زندگی کے ہر حصے کو روشن کرنے میں مددگار

ثابت ہو وہ ایک والہانہ محبت کے دلدادہ تھے جس میں آفاقیت کے عنصر بدرجۂ اتم پائے جائیں، اور ایسے لمحات کی تلاش میں رہتے تھے جس میں اپنے سارے کرب واضطراب کو ٹھنڈے پانی کا غسل دے سکیں، اس حالت میں وہ نہ تو اپنے کسی عزیز کے وہاں ٹھہرتے تھے اور نہ یار، دوستوں سے ہمکنار ہوتے تھے بلکہ ہوٹل کا سہارہ لیتے پردیسی کے خطوط کی دوسری جلدی میں ناہید کو تخاطب کر کے لکھتے ہیں،

''سکون سے کام نہیں ماندگی کا نام نہیں ☆ مرے سفر میں کہیں منزل ومقام نہیں

یہ محض شعر نہیں بلکہ اپنا اصلی مزاج ہے، ذوق سفر میرے خمیر میں ہے''

بیدلؔ کے شاعرانہ کیفیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں،

''وہ میری ہی طرح اپنے دیس میں خود کو پردیسی محسوس کرتا تھا اور اپنوں کے درمیان بے گانہ تھا'' [1]

مجنوں اشتراکی نظام کے حامل تھے اس لئے سرمایہ دارانہ نظام سے بیزار تھے، اپنے خطوط میں اشتراکی نظام کی خوبیوں کو سراہا ہے اور ایسے نظام کے خواہاں تھے جو انسانی فلاح و بہبود کا آئینہ دار ہو جہاں انسانیت چیختی اور بلکتی ہوئی نظر نہ آئے بلکہ مساوات کا دور دورہ ہو،

مجنوں کے پردیسی کے خطوط ہوں یا وہ خطوط جو ارمغان مجنوں میں ملتے ہیں یا ان سے گفت وشنید میں جو باتیں سامنے آئیں اس میں مجنوں کی ذاتی زندگی کا عکس نظر آتا ہے کیونکہ ان کی زندگی میرے بڑے قریب سے گذری ہے اس لئے ان کی زندگی کے سارے خدوخال، تذبذب اور اضطراب بے چینی اور تفکرات کی برجستگی ان کے خطوط کی آئینہ دار ہے، ان کے والد فاروق دیوانہ جو آزاد منش تھے، انھوں نے اپنی اولادوں کی طرف توجہ بہت کم دی مسائل زندگی کا حل کرنے کے لئے معاشی

---

[1] (ڈاکٹر شاہین، فردوس ص ۲۵۲)

سرگرمیوں کی پریشانیوں کو بھی مجنوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اٹھائے رکھا۔

جس کی زندگی صحرا نوردی پر مشتمل ہو وہ شخصیت احمد صدیق مجنوں کی ہے یہ حقیقی جھلکیاں کسی نہ کسی شکل میں ان کے خطوط میں رونما ہیں یہ خطوط ان کے گرانقدر زندگی کا نمونہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں تنقیدی عناصر کی شمولیت کی نشاندہی کرتا ہے، بالکل اسی طرح سے جس طرح سرسید کے (سمندر پار سے خطوط) مسلمانوں کے تعلیمی فقدان، سیاسی کرب واضطراب کی بے چینیوں سے پر ہے اسی طرح سے مجنوں کے خطوط بھی تنقیدی محاسن کو لئے ہوئے اپنے گردوپیش کے حالات وطن میں بے وطنی کا احساس کا آئینہ دار ہے، ناہید کے نام ایک خط میں اپنی زندگی کی کلفتوں اور سماجی، سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جب چند قدم آگے بڑھتے ہیں تو انھیں یہ احساس ہوتا ہے۔

> ''میں اس خیال سے خوش ہوں کہ اب قیام سے زیادہ حرکت اور حضر سے زیادہ سفر کے امکانات زندگی میں پیدا ہورہے ہیں اس وقت یہ صورتِ حال کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر میں اس کو ایک خوش آئند پیش خیمہ سمجھتا ہوں اب دیس پردیس کا جھگڑا ختم ہونے والا ہے اب ہم پر حقیقت روشن ہورہی ہے کہ آدمی کو صرف با آرام اقامت گاہوں کی ضرورت ہے، مستقل گھر اور اثاثے کی ضرورت نہیں ہے زندگی سکونت کا نام نہیں ہے زندگی تو مسلسل سفر ہے جس میں ہم کو جابجا بسیرا لیتے رہنا ہے ایک بہت پرانا شعر ہے۔
>
> آج دنیا میں ہیں کل روح کرے گی پرواز
> یہ سکونت تو نہ ٹھہری یہ بسیرا ٹھہرا'' [1]

مجنوں کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ انسان کو وسیع النظری کا درس دینا

---

[1] (پردیسی کے خطوط جلد دوم)

چاہیئے تا کہ اس کی ساری جبلتیں خود اس تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں، یاسمین کے نام ایک خط میں انھوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آج ایک مرکزی سوال یہ اٹھتا ہے کہ دنیا کو کس طرح سنوارا جائے تا کہ ہر چیز ہر نکھار آ جائے یہ حقیقت ہے کہ چاند پر جانے والے مسافر جب سطح زمین سے کافی بلندی پر پہنچے تو یہ دنیا سبز مخمل میں لپٹی ہوئی اس طرح چمک رہی تھی کہ گویا اس پر نکھار آ گیا ہے، مجنوں ایسے ہی دنیا کے طالب تھے اور جمالیات کے پرستار تھے ان کے تصور عشق پر مشرقیت کا غلبہ تھا اس میں مغربی نکات کچھ اس طرح ضم ہو گئے جس سے ان کے تصورات عشق کا معیار بلند ہو گیا، وصل کو فریب سے تشبیہ دی اور فراق کو ابدی سکون کا محور قرار دیا، ان کا نظریہ محبت جذبات کی رو میں نہیں بہتا ہے بلکہ ان بلندیوں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے جس کی مثالیں کمیاب ہیں وہ عشق کو ہوس کے چنگل سے پرے دیکھنا چاہتے ہیں، محبت کو زندگی کی قوت سے تشبیہ دی ہے اور مفکروں کے نظریہ کے مطابق وہ ہر چیز کی حرکت کی ذمہ دار ہے، باری تعالیٰ نے جب دنیا کی تخلیق کی تو عورت کو حسن اور دل کشی کا درجہ عطا کیا جس نے دنیا کو گل گلزار بنانے میں کارہائے نمایاں انجام دیا اس کی موجودگی سے اتنے عشق و محبت کے چشمے رواں دواں ہوئے ہیں جس نے دنیا کی رونق کو پراسرار بنا دیا اور تمام موجودات محبت کے شامیانے کے نیچے محبت کی سرپرستی اور زندگی کے کوائف سے لطف اندوز ہو رہے ہیں یہی محبت ہے جس نے زندگی کو رواں دواں بنایا اس لئے اس کائناتی حرکت میں وہ محرکات بھی شامل ہیں جس کو مطالبہ جنسی کہتے ہیں، مجنوں کی نظر میں یہ مطالبہ بہت ادنیٰ درجہ کا ہے، مجنوں ہر دور میں جوان رہے کیونکہ وہ نوجوانوں کے دل میں اترنے کا گر جانتے تھے اور اپنی باتوں کو بڑی سلیقگی سے ان تک پہنچاتے تھے وہ جانتے تھے کہ نوجوانوں میں وہ ولولہ ہے جو محبت کی سنگلاخ اور پرخار زمین کو سر کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتی ہے ان کا خیال ہے کہ،

"محبت فطرتاً تو ایک ایسا خروش ہے جس میں جسم اور روح

دونوں یکساں شریک ہیں لیکن اگر جسم سے قطع نظر کر لینے کے لئے خارجی اسباب وعوارض مجبور کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ صالح اور مستقیم فطرت رکھنے والا کھرا انسان صرف روح کی آسودگیوں میں مست وسرشار ہو کر اپنی تمام جسمانی محرومیوں کو بھول نہ جائے یہی ہے جسم اور روح کا فرق اور یہی ہے مجاز اور حقیقت کا اصلی راز" [۱]

مجنوں نے اپنے خطوط کی دونوں جلدوں میں جا بجا عشق ومحبت کی تشریح کی ہے اور اپنے زاویۂ نظر کو بڑے وسیع انداز سے پیش کیا ہے جس میں جنسی تعلقات کو بھی پرے نہیں رکھا گیا مجنوں نے اپنے مکتوبات کی چاشنی بڑھانے کے لئے جن ناموں کو تجویز کیا ان کا تعلق محبوب مجازی سے ہے وہ یاسمین ہوں ناہید یا کوئی اور، اس صنف کو اس لئے اختیار کیا گیا کہ عشق ومحبت کو میدان میں توانائی انھیں دونوں فریق کی (عاشق ومعشوق) کے خواہشات واحساسات سے ہوتی ہے، مجنوں نے عشق کو عین نقطۂ نظر سے نہ دیکھتے ہوئے افادی نقطۂ نظر سے دیکھا اس سے اس کی منزل آگے کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے

مجنوں نے اپنے خطوط میں عشق ومحبت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ محبت دردمندی عشق کا وہ عظیم طاقت رکھنے والا عنصر ہے جو کبھی یونانیوں میں پایا جاتا تھا وہ اس بات کے قائل تھے کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

اور اس نے اس آگ کو رحمت بنا دیا ایسے عشق نظریاتی ہو سکتے ہیں مگر حقیقت میں کمیاب ہیں وہ اس عشق کے قائل نہ تھے جو حسن پرستی کی دہلیز تک جا کے رہ جائے وہ والہانہ عشق کے پرستار تھے جس میں عظمت ہی نہیں بلکہ انسانی فلاح وتقدس کا راز

---

[۱] (پردیسی کے خطوط جلد دوم ص ۱۲۵)

بھی پوشیدہ ہے۔

عشق نے غالب نکما کردیا

غالب کے مندرجہ بالا مصرع کو کفریت کا درجہ دیتے ہیں، مگر انھوں نے کہیں یہ بھی کہا ہے کہ "عشق انسان کی سب سے بڑی بدبختی ہے" ان کے عشق کے نظریہ میں تضاد کس وجہ سے آیا اس کی تشریح مجنوں ہی کر سکتے ہیں،

مجنوں نے اپنے 'پردیسی کے خطوط' ارمغان مجنوں کے خطوط یا ان کے ذاتی خطوط ہوں جو انھوں نے اپنے رشتہ داروں، دوستوں، یا ادب نوازوں کو لکھا ہے اس میں آداب والقاب کی لمبی بندشوں سے گریز کیا ہے یہ ضرور ہے کہ مجنوں کے خطوط تنقیدی ادب میں ایک نئے شگوفے ہیں اور ایک منفرد راہ پیدا کرنے کی کاوش ہے مگر جہاں خطوط کی ادبیت کا سوال ہے وہ اس کے پہلے زینے تک پہنچ سکے ہیں۔

غالب کے خطوط کو دیکھئے تو ہر خط پر بے ساختہ واہ کہنے کو جی چاہتا ہے، مولانا آزاد کے خطوط کی جادو بیانی اور سیاسی، سماجی حالات کی تصویر کشی غبار خاطر کی جان ہے، شبلی نعمانی نے میر مہدی کے نام جو خطوط لکھے یا اس کے علاوہ دوسرے مشاہیر ادب کے نام جو خطوط ملتے ہیں اس کی جاذبیت اور دل کشی قابل قدر ہے مجنوں اس درڑ میں بہت بعد میں آئے البتہ ان کے تیز طرار دماغ نے خطوط میں تنقیدی مسائل کو اجاگر کرنے پر اکسایا اور یہی مسائل ان کے خطوط کے قبولیت کی بنا بنے مجنوں نے اپنے خطوط میں دل کشی پیدا کرنے کے لئے محبوب مجازی کا سہارہ لیا ہے اور پیکر حسن کی رعنائیوں کی دل آویز تصویر پیش کی ہے ان کی یہ کاوش قابل قدر ہے انھوں نے اردو ادب میں ایک نیا چراغ روشن کیا،

ختم شدہ

(۹)

مجنوں کی ترجمہ نگاری

ترجمہ نگاری

احمد صدیق مجنوںؔ کی عظمت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ان کی یہ کوشش آخری سانس تک جاری رہی کہ اردو ادب کی وسعت کے لئے ایسے راستے ہموار کردیئے جائیں کہ اردو زبان کو دوسری عالمگیر زبانوں کے سامنے زانوئے تلمذ نہ تہہ کرنا پڑے، اس لئے انھوں نے اردو ادب کے ہر صنف اور ہر گوشے میں برملا جھانکنے کی کوشش کی اور اس میں ایسے نقوش چھوڑے جو آنے والی نسلوں کے لئے رہبری کا کام کرے مجنوں نے تقریباً اردو کے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے یہاں تک کہ مختلف زبانوں سے اچھے مضامین اور انگریزی زبان پر بھی اچھی درسترس رکھتے تھے اس لئے انھوں نے اس زبان کے مختلف ڈراموں اور مضامین کا ترجمہ اردو زبان میں پیش کیا جو اردو ادب کے ترقی میں معاون ثابت ہوا انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں آسکر وائلڈ کی Solome اور ٹالسٹائے کے ڈرامے کا ترجمہ ابوالخمر کے نام سے کیا ان انگریزی مفکروں کے ادب لطیف نے مجنوں کو اتنا متاثر کردیا کہ انھوں نے ٹالسٹائے کے ڈرامے کو اپنی بیماری کی حالت میں ایک ہفتہ میں مکمل کردیا یہ دونوں ڈارامے انھیں فراق گورکھپوری کے توسل سے ملے بقول فراق کہ مجنوں نے سالوی کا ترجمہ اردو زبان میں بڑی تیز رفتاری اور انہماک سے کیا ان دونوں ترجمے کے بعد موصوف نے برناڈ شاہ کا ڈرامہ (بیک ٹومیتھوسلا) کا اردو ترجمہ (آغاز ہستی) کے نام سے پیش کیا اسطرح مجنوں کے ترجمے کا دور چلتا رہا رسالہ (ایوان) میں لارڈ بائرن کی تمثیل کا ترجمہ قابیل کے نام سے لکھا، مریم مجدلانی کے نام سے ان کا جو ترجمہ ملتا ہے وہ (مارکس ماہئرلنک) کی تمثیل کا ترجمہ ہے جو قارئین کے لئے ایوان

رسالہ کی دین ہے انھوں نے ہندی کی مشہور کتاب (سنگھاسن بتیسی) کا ترجمہ اردو میں کیا یہ تمام کاوش اس بات کی دلیل ہیں کہ مجنوں کو اردو ادب سے بے پناہ عشق تھا اور وہ اس کو بنتا اور سنورتا ہی دیکھنا چاہتے تھے (سنگھاسن بتیسی) لگ بھگ تین درجن کہانیوں پر مشتمل ہے، مجنوں کا خیال تھا کہ یہ کہانیاں ہمارے بزرگوں کی دین ہے جس سے ہمارے مدارس میں آنے والی نئی نسلوں کا مذاق اور علمی شعور بلند اور بہتر ہو سکے گا، مجنوں کی جولانئ طبع نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ وہ ایک اچھے نقاد ہی نہیں بلکہ ترجمہ نگار بھی ہیں ان کی مترجم کتابیں بہت مقبول ہوئیں،

مجنوں جب شعبہ اردو علی گڈھ یونیورسٹی سے منسلک تھے اسی دوران ساہتیہ اکیڈمی نے شیکسپئر کا ڈرامہ (کنگ لیئر) کے ترجمے کا کام ان کو سونپا جس کو مجنوں نے بڑی خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، ڈاکٹر منظر عباس نقوی نے مجنوں کے اس کام کی تشریح اس طرح سے کی ہے کہ وہ مجنوں کے زیر نگرانی تحقیقی کام کر رہے تھے سردیوں کا زمانہ تھا اللہ والی کوٹھی کے بالائی حصہ میں، موصوف قیام پذیر تھے میں جب پہنچتا تو کرسیاں دھوپ میں رکھ دی جاتیں اور وہ کنگ لیئر ڈرامے کی کتاب سے اس طرح ترجمے کرتے جاتے جیسے اردو ترجمے کی کتاب پڑھ رہے ہوں اور اس کام کے دوران کسی بھی لغت کا سہارہ لیتے نہیں دیکھا گیا،

ترجمے کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مجنوں نے ملٹن کی المیہ تصنیف Sanson- Agamistes کا ترجمہ شمسون مبارز کے نام سے کیا جو اس میدان میں ان کا آخری ترجمہ سمجھا جاتا ہے، مجنوں کو انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کرنے کا احساس اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اردو ادب میں ڈراموں کا فقدان تھا گنے چنے ڈرامے نظر آتے تھے، ڈرامہ نویس کی حیثیت سے جو شخص قابل ذکر ہیں اس میں امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع، منشی دوارکا پرشاد افق، شوق قدوائی وغیرہ ہیں، مجنوں کے ترجمے کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے فراق جو ان سے بہت قریب تھے یہ کہنے سے گریز

نہیں کر سکے کہ انیس سال کا لڑکا جس کے اندر اتنے جواہر پارے چھپے ہوئے ہیں یقین نہیں آتا انگریزی محاوروں، لفظوں اور اصطلاحوں کا اتنا تیر بہدف ترجمہ کر دے کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں، ان کی مترجم کتاب مریم مجدلانی جو تین ڈراموں پر مشتمل ہے ان کے ترجمہ نگاری کی ایک اچھی تصویر پیش کرتی ہے۔ جس کے نام حسب ذیل ہیں،

(۱) مریم مجدلانی مصنف ماہٹر لنک

(۲) سالوی مصنف آسکر وائلڈ

(۳) قابیل انگریزی کے مشہور ادیب لارڈ بائرن کی تمثیل کا ترجمہ

مریم مجدلانی جو مارس ماہٹر لنک کا تمثیلی ڈرامہ ہے اس سلسے میں مجنوں نے اس کو تمثیل نگار کی حیثیت سے دیکھا ہے بلیغ النظری اور انسانی جسم کے اندرونی وبیرونی مادوں کا انکشاف کے ساتھ روحوں کا باضابطہ تعلق اور انسانی فعل میں اس کی کارکردگی کو پیش کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ کچھ نقادوں نے اس کے اس تمثیل کو بہت قریب سے نہیں دیکھا اس لئے اس پر ناکامی کا الزام لگا دیا اور یہ کہا کہ انسانی تمثیل کی حیثیت سے اس میں کوئی جان نہیں ہے مگر موصوف کے نظریے سے یہ بات حقیقت سے پرے ہے ان نقادوں کی نظر میں،

"مسیح اگر مردوں کو جگا دیتا ہے اور زندوں کو اس طرح اپنی طرح کھینچ لیتا ہے کہ وہ خواب میں چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جس طرح مریم مبہوت اور از خود رفتہ ہو کر اس کی طرف بے اختیار بڑھتی ہے تو اس میں کوئی ایسی انسانی کشمکش نہیں ہے جس کو ایک المنامہ میں منتقل کیا جا سکے" [۱]

مجنوں اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان نقادوں کو مسیح ایک فوق البشر نظر آتا ہے

---

[۱] (ماخوذ مریم مجدلانی ص ۱۰)

اور مریم مجدلانی ایک بیوا کی حیثیت سے کند اور بے روح شخصیت ہے نقادوں کی اس رائے سے نااتفاقی کرتے ہوئے مارس ماہٹرلنک کی اس تمثیل کو اس کی تصانیف کے شاہکاروں میں شمار کرتے ہیں اس لئے کہ تحت الشعور کے دھندلکوں کی اس سے بہتر نمائش ممکن نہیں تھی اسی نظریہ کے زیر تحت مجنوں نے اردو ادب کو ترجمے کا ایک نایاب تحفہ پیش کیا، سالوی آسکر وائلڈ کے ادبی کارنامے کو مجنوں نے اردو میں ترجمہ کر کے آسکر وائلڈ کے صحافتی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس بات کے خواہاں تھے کہ اس کے ترجمے سے اردو ادیبوں میں اس طرح کے مضامین کی کمیابی دور کرنے میں معاون ہوں گے اس ڈرامے کی سب سے بڑی مقبولیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کے مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اس ڈرامے کے ترجمے میں مجنوں نے آسکر وائلڈ کی جدت طرازیوں کو بڑے نفیس پیرائے میں ادا کیا ہے جو ایک بہت مشکل کام ہے، سالوی میں ابتدا سے انتہا تک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا سماں چھایا ہوا ہے اور سالوی کی شخصیت کا انوکھا پن، اس کی شان پر جو ہذیانی کیفیت طاری ہے وہ لا محدود ہے، اس کا ترجمہ مجنوں کے لئے ایک بڑا چیلنج تھا جس کو انھوں نے بڑی خوبیوں سے ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جو اردو قارئین کو مہمل اور غیر مانوس لگتے ہیں، ان کی بہتر تشریح کی ہے،

ان کی تیسری پیش کش انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی تمثیل (قابیل) کا اردو ترجمہ ہے جس میں آدم، حوا، قابیل، عزازیل وغیرہ کے مکالمے ہیں تمثیل کے ابتدا میں علامہ اقبال کے اس مکالمے کو بھی پیش کیا ہے جو جبرئیل و ابلیس کے درمیان میں واقع ہوا،

اب یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ مجنوں اس شعور سے باخبر تھے جو ایک اچھے اور باصلاحیت ترجمہ نگار میں ہونا چاہئے انھوں نے جو مختلف زبانوں کے ترجمہ پیش کئے ہیں، اس سے اردو ادب کے وقار میں اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس کی ترقی کے

لئے نئی شاہ راہیں بھی کھل گئیں اب آنے والی پود پر منحصر ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاہکاروں نے اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جو راہیں ہموار کی ہیں اس کو کہاں تک روشن مستقبل عطا کر سکتے ہیں،

(۱۰)

مجنوں کے سلسلے میں چند مشاہیر ادب کے تأثرات

(شوکت تھانوی)

"آپ کی پوری شخصیت آپ کے تخلص میں سما کر رہ گئی مختصر قسم کے پورٹ ایبل انسان ہیں گویا فطرت کی شارٹ ہینڈ میں مشاق کا جیتا جاگتا نمونہ وقامت میں فتنہ مگر باقی تمام حیثیتوں سے قیامت، ادیب، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، طالب علم، معلم سب ہی تو ہیں البتہ اس آدھی چھٹانک کے آدمی سے بڑے بڑے پہاڑوں کو مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے" [۱]

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری)

مجنوں گورکھپوری، عمر وسال، اور علم وفضل ہر اعتبار سے عہد حاضر کے بزرگ ترین ادیب ونقاد ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے ادیبوں میں سب سے معتبر اور باوقار قلم ان ہی کا ہے۔ [۲]

(ڈاکٹر اسلم فرخی)

مجنوں صاحب نوعمری کے زمانہ سے میرے لئے ادبی ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ [۳]

(صحر انصاری)

مجنوں گورکھپوری تاریخ ادب کی ایک جامع الصفات شخصیت ہیں شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور معلم کی حیثیت سے انھوں نے برصغیر کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ [۴]

---

[۱] (ارمغان مجنوں ص ۳۵) [۲] (ارمغانِ مجنوں ص ۵۴) [۳] (ارمغان مجنوں ص ۷۲)

[۴] (ارمغان مجنوں ص ۹۱)

(ڈاکٹر عبدالودود)

مجنوں غم واندوہ کی حالت میں تصویر کشی کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں اور اپنی دلکش تحریر سے ادب لطیف کا حق ادا کردیتے ہیں۔ (ارمغان مجنوں ص ۱۲۶)

(شبنم رومانی)

مجنوں صاحب کی شخصیت میں مقبول ومحبوب بن جانے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے وہ جس محفل میں جاتے ہیں جانِ محفل بن جاتے ہیں۔

(ارمغان مجنوں ص ۱۲۶)

احمد صدیق مجنوں کے بارے میں مختلف نقاد اور ادیبوں کے تأثرات

(۱) فراق گورکھپوری کا کہنا ہے "غزل کا یہ حال کہ شاید ہی کوئی مصرع ایسا رہا ہو جس میں چار اضافتوں سے کم کی ترکیبیں ہوں، غلطی یا کچاپن یا کم مشقی کسی بھی شعر میں نہیں ہر شعر سے ذہانت نمایاں اور شاعرانہ کاریگری بھی پوری چابک دستی کے ساتھ جلوہ گر تھی"۔ [۱]

(۲) مجنوں کی عمر ابھی مشکل سے انیس برس کی ہوگی اور میں اس امر کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ انیس برس کا لڑکا انگریزی شاعری، انگریزی نثر، سائنس اور فلسفہ اور جمالیات اور دیگر علوم کی انگریزی اصطلاحوں کا اتنا تیر بہدف ترجمہ کردے کہ آنکھیں کھل جائیں"۔ [۲]

---

۱ (حوالہ مشاعرہ بینک روڈ گورکھپور) ۲ (مجنوں گورکھپوری مشمولہ ارمغان مجنوں جلد اول ص ۲۴۳)

(ڈاکٹر سلام سندیلوی)

یہ حقیقت ہے کہ مجنوں اپنی سائنٹیفک تنقید کی بنا پر درجہ اول کے نقاد تسلیم کیے گئے ہیں۔ [۱]

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور)

گورکھپور کا سینٹ اینڈ ڈیوز کالج شہر کا ہی نہیں بلکہ مشرقی اضلاع کا سب سے بڑا کالج تھا اور مجنوں صاحب سب سے زیادہ بلند قامت ادبی شخصیت تھے۔ [۲]

(ڈاکٹر محمد یٰسین)

بیسویں صدی اردو ادب کے قد آور اور صف اول کے مشاہیر میں مجنوں گورکھپوری ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، شاعر، افسانہ نگار، نقاد، دانش ور، اور صاحب اسلوب انشاء پرداز کی حیثیت سے وہ نہ صرف نصف صدی تک آسمانِ ادب پر درخشندہ ستارے کی طرح ضوفشاں رہے بلکہ اپنی تخلیقی وتنقیدی کارناموں کی بدولت انھوں نے اردو ادب کی تاریخ میں بھی اپنا منفرد اور قابل رشک مقام حاصل کرلیا۔ [۳]

مجنوں کے مقبولیت کی ان گنت تحریریں آ کے جابجا ادیبوں اور نقادوں کے مضامین میں ملی ہوں گی یہ چند تأثرات بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

تمام شد

---

[۱] (ارمغانِ مجنوں ص ۴۴) [۲] (حوالہ رقص شرر ص ۶۰) [۳] (میگزین علی گڈھ، مجنوں گورکھپوری ص ۳۷۷)

(۱۱)

کتابیات

(کتابیات مجنوں گورکھپوری)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف ومرتب	ادارہ مطبع	سن اشاعت
۱	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۸۸ء
۲	دوش وفردا	مجنوں گورکھپوری	انیس اردو الٰہ آباد جید برقی پریس دہلی	۱۹۵۹ء
۳	نکات مجنوں	مجنوں گورکھپوری	کتابستان الٰہ آباد، اکتوبر	۱۹۵۷ء
۴	شعروغزل	مجنوں گورکھپوری	ادبی اکیڈمی کراچی	ب ت
۵	غزل سرا	مجنوں گورکھپوری	نئی دہلی مکتبہ جامعہ	۱۹۶۴ء
۶	غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۱ء
۷	شوپنہار	مجنوں گورکھپوری	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۸	تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۵۹ء
۹	تارریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	ایوان اشاعت گورکھپور	۱۹۳۵ء
۱۰	پردیسی کے خطوط (جلد اول) (جلد دوم)	مجنوں گورکھپوری	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سرفراز پریس لکھنؤ مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمٹیڈ	۱۹۵۷ء ۱۹۶۱ء
۱۱	نقوش وافکار	مجنوں گورکھپوری	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۵۱ء

۱۲	سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	دارہ فروغ اردو لکھنؤ سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۴۲ء
۱۳	خواب وخیال	مجنوں گورکھپوری	صدیق بک ڈپو لکھنؤ یونائیٹیڈ انڈیا پریس لکھنؤ	۱۹۴۳ء
۱۴	گردش	مجنوں گورکھپوری	کتب خانہ علم وادب دہلی	۱۹۴۳ء
۱۵	سنگھاسن بتیسی ترجمہ	مجنوں گورکھپوری	منشی نولکشور لکھنؤ	ب ت
۱۶	تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۶۸ء
۱۷	آغاز ہستی	مجنوں گورکھپوری	ایوان اشاعت گورکھپور ایوان پریس گورکھپور	۱۹۳۵ء
۱۸	حسن فطرت (مقدمہ)	مجنوں گورکھپوری		ب ت
۱۹	زیب النساء اور دیگر افسانے	مجنوں گورکھپوری	ساجدی پریس گورکھپور	
۲۰	نیستاں مرتب	مجنوں گورکھپوری	ایوان اشاعت گورکھپور	ب ت

ارمغانِ مجنوں حصہ اول، مجنوں کے خطوط، خودنوشت،

اور دوسرے ادیبوں کے تأثرات

تنقیدی حاشیے
نقشِ ناہید
مجنوں کے افسانے
سوگوارِ شباب
صیدِ زبوں
سرنوشت
سراب
زیدی کا حشر

(دیگر مصنفین کی کتابیں)

مجنوں گورکھپوری	محمد یٰسین پروفیسر شعبہ انگریزی علی گڑھ
رقص شرر	ملک زادہ منظور
ارمغان مجنوں جلد دوم	صہبا لکھنوی، شبنم رومانی، مشہور آفسٹ پریس۔ کراچی، اگست ۱۹۸۴ء
مجنوں گورکھپوری حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر شاہین فردوس، ایم، کے آفسٹ پریس، دہلی ۲۰۰۱ء
اردو افسانہ۔ عزیز فاطمہ	نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۰ء
اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر انور سدید	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۱ء
ادبی تنقید کے اصول۔ کلیم الدین احمد	کے جی سیدین میموریل ٹرسٹ جامعہ نگر دہلی ۱۹۸۳ء
تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۷۷ء
تاریخ جمالیات۔ سعید احمد رفیق	قلات پبلشرز کوئٹہ ۱۹۷۲ء
داستان سے افسانے تک۔ وقار عظیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء
عود ہندی (طبع دوم) ڈاکٹر سید محمد حسین	مطبع اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۲ء
غبار خاطر۔ ابوالکلام آزاد	آزاد اکیڈمی دہلی ب ت
یادگار غالب۔ مولانا الطاف حسین حالی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

رسائل

نگار کا نظیر نمبر	نومبر ۱۹۴۰ء
اردو افسانہ کے جدید میلانات	جون ۱۹۴۰ء
اردو نثر نیاز اور نئی نسل	مارچ ۱۹۶۳ء
سویرا۔ نیا ادارہ	ایڈیٹر: حنیف رائے نذیر چودھری
ایوان (گورکھپور	ایڈیٹر: مجنوں گورکھپوری
علی گڑھ میگزین	علی گڑھ
عالمی ادب اردو (دہلی)	ایڈیٹر: نند کشور وکرم
نگار، لکھنؤ و بھوپال	ایڈیٹر: نیاز فتحپوری

مصنفہ کی زندگی کے مختصر حالات

تین بھائیوں کی ولادت کے بعد ۱۰ر جنوری ۱۹۴۰ء بروز جمعہ ۲ر بجے دن کو حکیم عبدالقدوس مرحوم کے وہاں بڑی تمناؤں کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بشریٰ خاتون صدیقی رکھا گیا، اکلوتی ہونے کی وجہ سے ہر دل عزیز تھیں ابتدائی تعلیم گھر میں والدہ کے زیر نگرانی اور مولوی خلیل مرحوم کے توسل سے ممکن ہوئی، کبھی مدرسہ یا اسکول کا منھ نہیں دیکھا، ۱۹۵۵ء میں ادیب کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۶ء میں اپنے بھائی نجات اللہ صدیقی کی سرپرستی میں ہائی اسکول کا امتحان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بورڈ سے پاس کیا، مختلف وجوہات کی بنا پر تعلیم میں رخنہ اندازی آتی رہی بڑی کاوش کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں بی اے آنرس اردو کی ڈگری حاصل کی۔

بشریٰ کی شادی ہنگامی حالات کے زیر تحت ۱۹۶۰ء میں جناب صدیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ہوئی بعد ازاں گورکھپور یونیورسٹی سے ۱۹۸۰ء میں اردو سے ایم اے کیا اور ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ان کا عزم واستقلال تھا کہ انھوں نے اردو زبان میں اچھی صلاحیت حاصل کر لی تھی، ان کے بہت سے مضامین رسالہ آجکل، نیا دور، ہماری زبان، اور نگار وغیرہ میں شائع ہوتے رہے موصوفہ کی چا کتابیں (اردو کے غیر مذہبی سفرنامے) مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، اور سخنوران گورکھپور، منظر عام پر آچکی ہیں اس کے علاوہ انھوں نے کلام مجنوں کو مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کو اللہ تعالیٰ نے ان گنت صلاحیتوں سے نوازہ تھا اردو اکیڈمی

اتر پردیش نے ان کے کام پر انعام بھی دیا ہے چونکہ ایک روشن گھرانے کی چشم و چراغ تھیں ، اس دور میں کہا جاتا تھا کہ حکیم صاحب کے گھر میں تین طالب علم نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے گورکھپور کے وقار کو اونچا کیا،

نمبر ا/ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی (بھائی)

نمبر ۲/ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی (بھتیجے)

نمبر ۳/ڈاکٹر بشریٰ صدیقی۔

مگر افسوس کہ امراض نے انھیں ایسا گھیر رکھا تھا کہ اردو ادب کی زیادہ خدمت کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ۷/نومبر ۲۰۰۹ء کو اس دار فانی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئیں، اپنی دوران علالت مجنوں گورکھپوری کا یہ نسخہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئیں قارئین سے گزارش ہے کہ ان کے مغفرت کی دعا کریں۔

صدیق الرحمٰن

ناشر

صدیق الرحمٰن ــــ متصل نخاس پولس چوکی

احاطہ کورٹ صاحب گورکھپور۔ ۲۷۳۰۰۱